حیدر قریشی کی شاعری

مرتب

ہردئے بھانو پرتاپ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔ ۶

Haider Qureshi ki Shairi
Compiled By
Hriday Bhanu Partap
Year of First Edition:2013
ISBN 978-93-5073-245-8
Price Rs. 200/-

نام کتاب: حیدر قریشی کی شاعری
مرتب: ہردئے بھانو پرتاپ
سنِ اشاعت اوّل: ۲۰۱۳ء
مطبع: عفیف پرنٹرس، دہلی۔۶
قیمت: ۲۰۰ روپے

Published By

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6,(INDIA)
Ph:23214465, 23216162, FAX: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

والدین کی محبتوں اور شفقتوں کے نام
جن کے بے خوف ارادوں کی سیڑھیوں نے مجھے اس منزل تک پہنچایا

فہرست



شاعری پر مختلف ادیبوں کے ملے جلے تاثرات

مجروح سلطان پوری، ڈاکٹر وزیر آغا، سید ضمیر جعفری، گیان چند جین، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر انور سدید، کالی داس گپتا رضا، ادیب سہیل، ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ، ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، احمد ہمیش، انوار فیروز، ہارون الرشید ہارون، ڈاکٹر غلام شبیر رانا، غزالہ طلعت، ڈاکٹر فرحت نسیم ہاشمی، مسعود منور، نجمہ منصور، اکبر حمیدی، فیصل عظیم، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر سعادت سعید، شگفتہ الطاف، نیاز احمد صوفی۔



اپنی شاعری کے حوالے سے حیدرقریشی کی باتیں



مختلف انٹرویوز میں شاعری کے بارے میں حیدرقریشی کے خیالات:



شاعری کا مختصر انتخاب



حیدرقریشی کے شعری مجموعے اور کتابی صورت میں اشاعتیں

سلگتے خواب(غزلیں)'
ناشر:تجدید اشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۱ء۔
عمرِ گریزاں(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)'
ناشر:تجدید اشاعت گھر لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔
محبت کے پھول(ماہیے)'
ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔
دعائے دل(غزلیں،نظمیں)
ناشر:نصرت پبلشرز لاہور۔مطبوعہ ۱۹۹۷ء۔
چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں' نظمیں' ماہیے**
ناشر:سرور ادبی اکادمی۔جرمنی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔
درد سمندر(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)
یہ مجموعہ کلیات'عمرلاحاصل کا حاصل' میں شامل کیا گیا ہے۔

☆☆☆

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات۔میگزین سائز ۴۲۸صفحات
ناشر:معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۵ء

☆☆☆

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات،لائبریری ایڈیشن۔میگزین سائز ۶۱۶صفحات(بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)
ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۹ء

☆☆☆

قفس کے اندر

پہلے پانچ شعری مجموعوں کے ساتھ نئے مجموعہ ''زندگی'' سمیت چھ شعری مجموعے ایک ساتھ۔۔

عوامی اور اکانومی ایڈیشن چھ سو سے زائد صفحات کا میٹر صرف ۱۵۲ صفحات میں

سلگتے خواب　　عمرِ گریزاں　　محبت کے پھول

دعائے دل　　درد سمندر　　زندگی

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز خانپور۔مطبوعہ ۲۰۱۳ء

....

حیدر قریشی پر ہونے والا یونیورسٹی سطح کا کام

۱۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن**۔۔۔۔**منزہ یاسمین** کا اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء

۲۔**حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہتیں**۔۔۔**ڈاکٹر عبدالرب استاد** کا پی ایچ ڈی کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ**۔۔۔۔ہردئے **بھانو پرتاپ** کا ایم فل کا مقالہ، سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

۴۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**۔۔۔۔**عامر سہیل** کا ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔ ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، پاکستان

۵۔**حیدر قریشی کی افسانہ نگاری**　**راضیہ خان** کا ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

۶۔**حیدر قریشی۔حیات وخدمات**　**انجم آراء** کا ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔ کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا۔

....

بالواسطہ

۱۔**جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث**۔۔**شازیہ حمیرہ** سال ۲۰۰۹۔ ۲۰۰۷ء۔ اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

۲۔**اردو میں ماہیا نگاری ڈاکٹر صبیحہ خورشید** سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا سے پی ایچ ڈی کا مقالہ

پیشِ لفظ

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی عکاسی کرنے والی ایک ایسی زبان جسے عہد حاضر میں غیر یقینی طور پر مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اسے عوام الناس سے علیحٰدہ کیا جا رہا ہے، جسے اپنے ہی سرزمین پر پھولنے پھلنے کا بھرپور موقع نہیں مل پا رہا ہے، وہ اردو ہے۔ ہاں اردو جس کا جادو ہر قوم کے انسانوں کے دل و دماغ پر یکساں اثر کرتا ہے اور جس کے شیریں الفاظ ہندوستانی نغموں میں ایک ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو ہر مذہب، ہر طبقے کے لوگوں کو محظوظ ہونے کے لیئے یکساں مواد مہیا کرتا ہے۔آج ہندوستان میں اس کی حالت بہت اچھی نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو کے جادوئی الفاظ کی اثر آفرینی میں کمی آ گئی ہے بلکہ اردو اپنی خصوصیات کا لوہا، ہندوستان ہی نہیں دنیا کے دیگر مما لک میں منوا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے علاوہ ایران، امریکا، کناڈہ، جرمنی، قزاکستان اور عرب وغیرہ ملکوں میں اردو بتدریج ترقی کر رہی ہے۔حیدر قریشی کا تعلق انھیں بیرونی ممالک میں سے ہے۔گرچہ ان کی پیدائش پاکستان میں ہوئی لیکن آج وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ جرمنی میں مقیم ہیں۔وہ جرمنی میں رہتے ہوئے بھی اردو زبان و ادب کے لیئے بیش قیمتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھیں اردو ادب کی مختلف نثری وشعری اصناف میں کامیابی حاصل ہے۔ان کے مختلف تخلیقی کارناموں پر منحصر ان کی کلیات ''عمر لا حاصل کا حاصل'' تمام ادبی رنگینیوں اور رعنائیوں سے لبریز ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔یہ کتاب نہ صرف حیدر قریشی کی شخصیت کو بیاں کرتی ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی پھیلی ہوئی شاخوں کا بھی پتہ دیتی ہے۔ حیدر قریشی نے نہ صرف ماہیا کی روایت کو مضبوط کیا بلکہ غزل اور نظم میں نئے نئے موضوعات اور نئی نئی اصطلاحات کا استعمال کر کے اردو شاعری کے دامن کو مزید وسیع کیا۔ انھوں نے اردو غزل

میں انسانی رشتوں کو ایک نئے انداز سے پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں صرف محبوب کے ناز و نخرے نہیں ملتے بلکہ ان کی پوری Family والد، والدہ، بھائی، بہن، بیوی اور بچے وغیرہ سے ان کی محبت وشفقت کا سراغ بہت خوب ملتا ہے۔اسی طرح ان کی نظمیں بھی عام روش سے بالکل ہٹ کر ہیں۔ان کا تنقیدی شعور ان کی نظموں میں صاف ظاہر ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اپنی نظموں کے ذریعہ صرف ایک پہلو کو اجاگر نہیں کرتے بلکہ وہ انسانی زندگی کے سیاہ اور سفید دونوں پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ حیدر قریشی کی شاعری میں وطن کی مٹی کی خوشبو کا احساس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی نجی زندگی کے عناصر بھی خوب ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں خارجی مسائل کے علاوہ ذاتی مسائل بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔نثری تخلیقات کے ذریعے کسی کی شخصیت کا پتہ لگانا آسان ہوتا ہے جبکہ شاعری کے ذریعے نہیں لیکن حیدر قریشی نے اپنی پوری کہانی اپنی شاعری میں بیان کر دی ہے۔ حیدر قریشی کی شاعری کے ذریعہ قارئین کو ان کی زندگی کی مختلف پہلوؤں سے آشنا ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔

کسی شاعر یا ادیب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیئے محض ایک کتاب کافی نہیں ہے پھر بھی یہ کتاب حیدر قریشی کی شخصیت کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھنے کے لیئے ایک اہم دستاویز ہے۔آج حیدر قریشی کے ادبی کارناموں کے حوالے سے تحقیقی کام تیزی سے ہو رہے ہیں۔ یہ تحقیقی کام نہ صرف حیدر قریشی کی شخصیت کو ظاہر کریں گے بلکہ اردو ادب کو ایک نئی جہت سے آشنا کرائیں گے۔ان کے ادبی کارناموں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدر قریشی بلا شبہ اس عہد کے ایک بڑے شاعر و ادیب ہیں۔ گرچہ انھوں نے اردو ادب کے بیشتر اصناف کو ہاتھ لگایا پھر بھی وہ ہر صنف میں یکساں کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب اس کا اعتراف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بہت شوق سے پڑھی جائے گی اور اس سے حیدر قریشی کے مطالعے میں مدد ملے گی۔

ہردئے بھانو پرتاپ

حیدر قریشی بنام اردو شاعری

ہردئے بھانو پرتاپ (دہلی)

دنیا کی ادبی تاریخ کی اچھی طرح سے جانچ پرکھ کی جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی بھی زبان کا ادبی سرمایہ صنف شاعری سے محروم نہیں ہے۔ بلکہ یہ ادبی سرمایہ شاعری ہی سے شاداب ہے۔ یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کنارہ نہیں کر سکتا ہے۔ آج نثری ادب بھلے ہی آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہو لیکن یہ بھی کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر زبان میں شاعری ہی سب سے پہلے وجود میں آئی اور کسی بھی عہد میں اس کی اہمیت وافادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اسکی شکل وقتاً فوقتاً بدلتی رہی ہے۔ پھر بھی جس اثر انگیزی کے ساتھ شاعری لوگوں کے دلوں کو چھوتی ہے وہ اثر انگیزی نثری اصناف میں بمشکل ہی پائی جاتی ہے۔اردو زبان کی شیرینی ، دلکشی و دلآویزی کون تسلیم نہیں کرتا خواہ وہ کوئی اردو داں ہو یا غیر اردو داں، لیکن جہاں کہیں بھی اردو کے الفاظ لوگوں کے کانوں میں پڑتے ہیں وہ اس کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے اصل معنی و مفہوم تک نہ پہنچ سکے۔ جو زبان اپنے اندر اس قدر صلاحیت اور اثر انگیزی رکھتی ہو اگر اس میں شاعری کی جاتی ہے تو اس شاعری کی آب وتاب ، دلکشی ، دلآویزی اور اثر انگیزی میں چار چاند لگ جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری سے محظوظ ہونے والے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے۔

ابتدائی زمانے سے ہی اردو زبان میں صنف شاعری کے حوالے سے نئے نئے تجربے ہوتے رہے ہیں۔ ان تجربوں سے وجود میں آنے والی شعری ہیئتیں اپنا ایک خاص وصف رکھتی ہیں ، جس کے سبب ان کی ایک الگ ہی پہچان ہوتی ہے۔لیکن ایسا بھی نہیں کہا جا

سکتا کہ قدیم اصناف اپنی آب و تاب کھوتی رہیں ۔ پھر بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ قدیم اصناف جن کا تعلق ہندوستان کے قدیم رسموں اور رواجوں سے تھا ، چونکہ جب قدیم رسموں رواجوں کا خاتمہ ہوا تو کسی قدر ان اصناف کی اہمیت میں کمی آئی ۔ بہ صورت دگر جو اصناف زمانے کے تغیرات کو اپنے اندر سمونے کی طاقت رکھتی تھیں وہ آج بھی بدستور ہمارے بدلتے ہوئے تہذیب وتمدن میں زندہ و پائندہ ہیں ۔

اردو شاعری کی تاریخ میں ہر زمانے میں اعلیٰ درجے کے شاعر پیدا ہوئے اور انھوں نے اردو شاعری کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کے قریب لانے کی کوشش کی ۔ ان کے تجربے شاعری کے حسن کو بتدریج ضیا بخشتے رہے ۔ اردو شاعری میں نت نئے نئے تجربے ہونے کے سبب اردو شعری اصناف کا ذخیرہ شعری رنگینیوں اور رعنائیوں سے لبریز ہے ۔ اردو شاعری کی انھیں رنگینیوں اور رعنائیوں کے بیچ ایک ایسا شخص اور شاعر سانس لے رہا ہے جس نے اپنی کوششوں اور کاوشوں سے شاعروں کی اس بھیڑ میں بھی اپنی راہ الگ بنائی ۔ جی ہاں وہ نام ہے حیدر قریشی ۔لوگ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی اس کی قدر و منزلت بھول جاتے ہیں ،اپنے وطن کی مٹی اور خوشبو کو نہیں پہچانتے ہیں ۔انھیں دیگر ملکوں کی سیر، وہاں کی رنگینیاں ،تہذیب وتمدن زیادہ پسند آتے ہیں جو انھیں کسی نہ کسی قدر اپنے تہذیب وتمدن سے دور لے کر جاتا ہے ۔لوگ ایسے ماحول میں اپنے نقلی چہرے ظاہر کرتے ہیں دل میں لاکھ غم ہو لیکن ان کے چہرے پر بناوٹی ہنسی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے ۔ایسے لوگوں سے قطع نظر حیدر قریشی کی شخصیت اپنی مثال آپ ہے ۔ان کی زندگی کا سفر ایک چھوٹے سے محلے سے شروع ہوکر جرمنی تک پہنچا لیکن ان کی زندگی ایک ایسے تناور درخت کی مانند ہی جس کی شاخیں چاروں سمت پھیلنے کے باوجود اس کی جڑ اسی جگہ پیوست ہے جہاں سے اس کی قندیل پھوٹی تھی ۔ان کے ہر تخلیقی نمونے میں ان کی اپنی زندگی ، ان کا اپنا پیارا وطن ، وطن کی خوشبو ، وطن کے لوگ ، وطن کی تہذیب و تمدن رشتے ناطے سب کچھ بغیر کسی ملاوٹ کے ہو بہو نظر آتا ہے ۔ایسی شخصیت کو ہم صدہا سلام کرتے ہیں ۔جس طرح ''جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے'' اسی طرح ترک وطن سے وطن کی محبت کو کبھی دل سے بھلایا نہیں جا سکتا اور ایسی

محبت ایک شاعر یا ادیب ہی کر سکتا ہے ۔ جسے حیدر قریشی نے بخوبی کر دکھایا ہے ۔ اردو ادب میں یہ نام اپنی کامیابی و کامرانی کے سبب ہمیشہ یاد کیا جائے گا ۔

حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح سے ان کا رسالہ ''جدید ادب'' اردو دنیا کی سرگرمیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر ہمارے لیئے ایک خوبصورت گلدستہ پیش کرتا ہے اسی طرح حیدر قریشی کی شخصیت بھی اردو ادب کی مختلف اصناف کی رنگینیوں و رعنائیوں سے لبریز ایک حسین وجمیل گلدستہ ہے۔اردو ادب میں ایسی شخصیت شاذ و نادر ہی نظر آئے گی جو اردو ادب کی اتنی ساری اصناف میں مکمل طور سے کامیاب ہو۔حیدر قریشی اس کی ایک زندہ جاوید مثال ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ بیشتر شعراء و ادباء نے اپنے مخصوص میدان سے ہٹ کر بھی طبع آزمائی کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔

حیدر قریشی کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے بیک وقت ماہیا ،غزل ،نظم ،دعا ،سلام وغیرہ تخلیق کیااور ان تمام اصناف کی فنی شرطوں کو بھی بڑی کامیابی سے پورا کیا ۔یہی وجہ کہ ہمارے دور کے نقاد یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں کہ آخر حیدر قریشی کو کس میدان کا شہہ سوار قرار دیا جائے۔وہ تو ہر فن مولیٰ معلوم ہوتے ہیں۔پھر بھی جن شعری اصناف کے حوالے سے ان کو خاص طور سے سراہا جاتا ہے وہ ماہیا ،غزل اور نظم ہیں۔ان تینوں اصناف میں بھی خاص توجہ دی جائے تو ان کی ماہیا نگاری کا پلہ ان کی غزلوں اور نظموں پر بھاری پڑ جائے گا۔

حیدر قریشی کی ماہیا نگاری کے حوالے سے بات کی جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اس میدان میں نہ صرف تخلیقی کارنامے انجام دیئے بلکہ تحقیقی تنقیدی کارنامے انجام دے کر اردو ادب میں ماہیے کی جڑ اور بھی مستقل کر دی ۔اردو ماہیا نگاری ایک طویل عرصے سے زیر گفتگو رہی ہے اور بیشتر محققوں نے مکمل سکون بخش نتیجہ نہیں پیش کیا۔اس سے متعلق سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اردو ماہیا نگاری ماہیئے کے فنی تقاضے کو کس قدر پورا کرتی ہے۔اس کے علاوہ اردو ماہیا نگاری کی جو تکنیک رائج ہے وہ کس قدر کامیاب ہے۔چونکہ حیدر قریشی سے قبل اردو میں ماہیا نگاری کی روایت تو قائم تھی لیکن وہ پنجابی ماہیا نگاری کے فن پر پورا

اترتی ہے یا نہیں اس سے اس دور کے ماہیا نگار غافل تھے۔حیدر قریشی نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ اردو میں ماہیا کی روایت پنجابی سے آئی ہے۔یہ پنجابی زبان کا عوامی گیت ہے ۔ماہیا پنجابی زبان کے لفظ ماہی سے نکلا ہے جس کا معنی بھینس چرانے والا شخص ہوتا ہے۔عام طور سے یہ بھینس چرانے والا شخص اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیئے اپنے محبوب کی یاد میں اس طرح کے گیت گنگنا تا رہتا تھا۔شادی بیاہ یا کسی جشن کے موقعے پر عورتوں کے ذریعہ گائے جانے کی روایت بھی مشہور تھی ،لیکن اردو شاعری میں ماہیے کی روایت کے حوالے سے حیدر قریشی سے قبل کسی نے مکمل جانکاری نہیں دی تھی ۔اس لیئے ان کی تحقیق سے قبل اردو میں جس قبیل کے ماہیے لکھے جا رہے تھے وہ ماہیے کے فنی تقاضے کو پورا نہیں کرتے ہیں ۔ ماہیے سے متعلق مکمل تحقیق کے بعد حیدر قریشی نے خود صحیح وزن کے ماہیے لکھ کر اردو شاعری میں باقاعدہ ماہیا نگاری کی بنیاد ڈالی ۔اپنے تخلیقی کارنامے کے علاوہ انھوں نے تحقیق کے میدان میں ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب منظر عام پہ لا کر ماہیا سے متعلق بیشتر بدگمانیوں کو دور کردیا۔

ماہیا کے میدان میں حیدر قریشی نے اپنا پہلا قدم خطوط اور مضامین کے ساتھ رکھا۔انھیں کے خطوط اور مضامین سے اردو ماہیے کی طرف لوگوں کی نظر بھی مائل ہوئی وگرنہ اردو میں ماہیا کی روایت درہم برہم طریقے سے چل رہی تھی ۔لیکن محض خطوط لکھنے سے ہی حیدر قریشی کا ارادہ پورا نہ ہو سکا اس لیئے وہ خود اس میدان میں اپنے تخلیقی فن کے ساتھ اتر پڑے۔''محبت کے پھول'' کے نام سے ان کے ماہیوں کا پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا ۔یہ نہ صرف حیدر قریشی کا پہلا مجموعہ ہے بلکہ اردو ماہیا کا پہلا مجموعہ ہے۔حیدر قریشی کے اردو ماہیے نہ صرف اس کے فنی تقاضے کو پورا کرتے ہیں بلکہ اس میں پیش موضوعات بھی اردو ماہیے کی اہمیت وافادیت کو دوبالا کرتے ہیں۔انھوں نے نہ صرف روایتی موضوعات کو اپنے ماہیے میں پیش کرنے کی کوشش کی بلکہ حقیقی زندگی سے جڑے تمام موضوعات کو ایک نئے پیراہن میں پیش کیا۔ان کے ماہیوں میں خصوصاً ذاتی، صفاتی، حیاتیاتی ،ملکی ، غیر ملکی ،قومی، بین الاقوامی کے علاوہ عام رشتوں کو بھی انھوں نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے

ماہیوں میں پیش یہ رشتے ان کے ماہیے کے حسن کو اور بھی خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو۔

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اس کی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

(امی کے لیئے)

یاد آ ہی گئے آخر
کچھ بھی سہی لیکن
بھائی ہیں میرے آخر

حیدر قریشی نے بھلے ہی خانپور سے لے کر جرمنی تک کا سفر کیا اور وہاں کی تہذیب و تمدن کو اچھی طرح سے دیکھا سمجھا، لیکن یہ ان کے عمدہ ذہن کی کامیاب تخلیقی صلاحیت کہیئے یا پھر خدا کا رحم و کرم، انھوں نے اپنے تخلیقی کارنامے میں اپنی زندگی کے سفر کو اپنے قوتِ مشاہدہ سے شروع تا آخر بہت ہی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ وہ محض جرمنی کی چکا چوند، جگمگاہٹ میں گم نہیں ہوتے بلکہ حب الوطنی کے جذبات کو اپنی تخلیقات کے ذریعے ہمیشہ نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ جس قدر پنجابی ماہیے میں جابجا پنجاب کی فضا نظر آتی ہے اسی طرح حیدر قریشی کے اردو ماہیے میں بھی ان کے وطن کے فضاؤں کی بہترین عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کا یہ کمالِ فن نہ صرف حیدر قریشی کی شخصیت کو مکمل کرتا ہے بلکہ اردو ماہیا نگاری کے فن کو بھی پختگی عطا کرتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں جہاں بھی پنجاب کے مناظر، تہذیب و ثقافت کا ذکر آتا ہے ماہیا اپنے فنی عروج پر نظر آتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

منظر ترے گاؤں کے
گرم دوپہروں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

سونے کی انگوٹھی ہے
پیار میں سچّی ہے
پر قول کی جھوٹی ہے

گرچہ انھوں نے روایتی موضوعات سے ہٹ کر بہت کچھ لکھا لیکن انھوں نے اردو شاعری کے سب سے عزیز ترین موضوع عشق ومحبت کو بھی نہیں چھوڑا، لیکن ان کے ماہیوں میں عشق کا بھی ایک نیا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ خوابوں، خیالوں کی رومانوی دنیا میں غفلت کی زندگی نہیں بسر کرتے بلکہ ان کا عشق اپنے منزل مقصود تک پہنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتا ہے۔ان کی شاعری میں عشق کے تمام پہلوؤں کا ذکر بہت ہی سلیقے کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ عشق کی ابتدائی مراحل میں نہ تو جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور نہ ہی اواخر میں تھکے ماندے نظر آتے ہیں۔ان کا یہ متوازن سلیقہ بھی ان کے کامیاب ماہیے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔مثال ملاحظہ ہو۔

وہ ہاتھ دعا والے
جسم عطا والا
اور ہونٹ صفا والے

اکبر حمیدی نے اپنے مضمون ''حیدر قریشی کے ماہیے'' میں لکھا ہے کہ:

''ماہیا در اصل دیہاتی زندگی کو دیہاتی تہذیب وتمدن اور دیہاتی مزاج کے ساتھ پیش کرتا ہے۔حیدر قریشی کے ماہیوں میں بھی ہمیں دیہاتی منظر دیہاتی لوگ اپنے سادہ، رسیلے جذبوں اور روایتوں کے ساتھ ملتے ہیں۔دیہات میں ایک روایت اور عادت چلی آ رہی ہے کہ واقعات کو فصلوں کے اوقات سے منسوب کرکے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے دیہاتی زندگی میں فصلوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور دیہات کے لوگوں کے انداز فکر کا بھی۔بہت سی شادیا گندم کی کٹائی سے پہلے یا بعد میں ہوتی ہیں۔گندم کی کٹائی سے پہلے سگائی کی اور جب گندم گھر آ گئی تو اسے

فروخت کر کے شادی کر دی ۔گندم کی کٹائی کے لیے بہت تیاریاں کی جاتی ہیں ۔اب تو خیر...................ایسا ہی ایک جذباتی سانحہ ہمارے شاعر کو پیش آتا ہے دیہاتی لوگوں کی ایک جذباتی واردات کو حیدر قریشی نے کس خوبصرتی سے پیش کیا ہے۔یہ واردات اندر ہی اندر بہت خاموشی سے واقعہ ہوتی ہے ۔ایک عاشق گندم کی کٹائی پر خاموشی کے ساتھ گاؤں کو خیر آباد کہہ کر چلا جاتا ہے کہ اس کی محبوبہ کی سگائی کہیں اور ہوگئی ہے۔ ؎

گندم کی کٹائی پر

چھوڑ دیا گاؤں

گوری کی سگائی پر''

حیدر قریشی کے ان ماہیوں کا مطالعہ کیجئے جو خاص طور سے پنجاب کی تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتے ہے، یہاں پر ان کا شاعرانہ شعور اتنا رواں دواں اور نکھرا ہوا ہے کہ وہ پنجابی ماہیا نگاروں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ان کے ماہیے آپ کے دل و دماغ کو پنجاب کی خوشبو سے اس قدر معطر کرتے ہیں آپ کے دل میں کسی طرح کا تجسس باقی نہیں رہتا۔ان کی اسی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے عبدالراب استاد نے اپنے مضمون ''حیدر قریشی کے ماہیئے'' میں لکھا ہے کہ:

''ماہیا کا میر کارواں، اس تحریک کا اصل محرک حسن نے تا دم تحریر زائداز تین صد ماہیے تحریر کئے ہیں۔ان ماہیوں میں جہاں پنجاب کی دھرتی کی سوندھی سوندھی بو باس مہکتی ہے وہیں اس مٹی سے اگنے والی گھاس اور پھولوں کی خوشبو اور پھلوں کی رس بھری مہکار محسوس کی جاسکتی ہے۔سونی اور مہیوال کے افسانوں کی روایت جھلکتی ہے ،کبھی بھلے شاہ اور نانک جیسی خدا ترس ہستیوں کے صوفیانہ کلام کی چاشنی جھلکتی ہے۔ان میں جہاں جرمنی کی مشینی زندگی بیان ہوئی ہے وہیں تہذیب وتمدن بھی عیاں ہوئی ہے ۔ان کے ماہیوں میں جہاں خدا کے زمرے گائے گئے ہیں وہیں حبیب خدا کی تعریف میں نغمے اور رشتہ داروں پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور کہیں خود پر بیتے ہوئے لمحات و کیفیات پر رائے زنی ملتی ہے ۔ماہیا آزاد ہونے کے

باوجود نظم کا سا تسلسل ان میں موجود ہے۔''

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

دنیا پہ کرم کر دے
پیار کی سینوں میں
پھر روشنیاں بھر دے

ان تمام تر خصوصیات کے علاوہ حیدر قریشی کی شش جہت شخصیت کے تمام پہلو بھی ان کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔ان کے ماہیوں میں یہ تمام پہلو اس کامیابی اور خوبصورتی سے جذب ہو جاتے ہیں جیسے کسی غزل میں شاعر مختلف موضوعات کو جذب کر دیتا ہے۔ان کے ماہیوں میں ایک طرف وطن کی محبت ،وطن کی مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے تو دوسری طرف جرمنی کی مشینی زندگی کی چکاچوندھ ذہن کو متاثر کرتی ،ایک طرف وطن کی تپتی بجھتی مٹی میں اگتے پھولوں اور پھلوں کی رنگینی اپنی طرف مائل کرتی ہے تو دوسری طرف جرمنی کے کل کارخانوں سے نکلے طرح طرح کی رنگ برنگی اشیا۔ان دونوں جگہوں کے مشاہدات ان کے ماہیوں کو ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔

ان کی ماہیا نگاری کی کامیابی کا ایک اہم پہلو فنِ محکات پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ اپنے ماہیوں میں خطہء پنجاب کی تصویر کشی کرتے ہیں تو پنجاب کے ہرے بھرے کھیتوں ،سبز درختوں اور سرخ پھولوں کا عکس قاری کے ذہن کو پنجاب کی آب و ہوا سے معطر کر دیتا ہے۔انھوں نے اپنے ایک ماہیے میں پنجاب (پنج +آب) کی نسبت سے ''دریاؤں کی مالا ہے'' کا ایک مصرع بہت ہی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔مثال ملاحظہ ہو۔

کیا روپ نکالا ہے
گردن میں اس کی
دریاؤں کی مالا ہے

محاکات کے علاوہ بھی ان کے ماہیوں میں ایہام کی کیفیت بھی اعلیٰ درجے کی ہے اور یہ ایہام اس بلند درجے کا ہے جسے غزل کے ناقدین نے 'مینا کاری میں ریزہ کاری' کا نام دیا ہے ۔ یہ ماہیے اردو شاعری کی روایتی ایہام گوئی کے حسن و لطافت سے قدرے خوبصورت ہیں ۔ کیونکہ ماہیے کا فن غزل سے بھی زیادہ ایجاز و اختصار رکھتا ہے ۔ اس لئے ماہیے میں شاعر کے خیال کی دھندلی تصویر اور بھی دلکش و حسین ہوتی ہے ۔ جس سے قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے ۔ قاری کا ذہن ایسی شاعری سے دیر تک محظوظ ہوتا رہتا ہے ۔ حیدر قریشی کی شاعری میں اس طرح کے بیشتر اشعار ہیں جوان کی شخصیت کو دوبالا کرنے سے کسی قدر چوکتے نہیں ۔

اردو شاعری میں تشبیہات و استعارات کے استعمال کی روایت ابتداء سے ہی چلی آ رہی ہے ۔ حیدر قریشی کے ماہیے بھی نادر تشبیہات و استعارات کے استعمال سے دلکش اور حسین ہو گئے ہیں ۔ مثلاً والد کے لئے برگد کی جٹا، ماں کے لئے دعاؤں کی چاندنی کی جھانکی، بیٹوں کو دریاؤں کی روانی اور گذری جوانی سے تعبیر کرنا وغیرہ ۔ اردو شاعری میں اس طرح کے تشبیہات و استعارات اس سے پہلے اور کہیں نظر نہیں آتے ۔ ان کی شاعری میں تشبیہات و استعارات اس لئے زیادہ خوبصورت اور کامیاب نظر آتے ہیں کیوں کہ حیدر قریشی انتخابِ الفاظ اور اس کا استعمال بہت ہی سلیقے اور لفظی رعایت کے ساتھ کرتے ہیں ۔ مثلاً اگر کہیں وادیٔ پنجاب کا ذکر آتا ہے تو وہاں جرمنی کی آب و ہوا کا کہیں کوئی گزر بسر نہیں ہوتا اسی طرح جب جرمنی کا ذکر آتا ہے پنجاب کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا کہیں کوئی شائبا تک نہیں ہوتا ۔

حیدر قریشی کے حوالے سے بیشتر لوگوں نے اپنے مضامین میں لکھا ہے کہ وہ عاشق مزاج شخصیت کے مالک ہیں لیکن وہ مایوس کن عاشق نہیں ہیں بلکہ وہ بغیر تھکے ہارے اپنی راہ

پر گامزن رہنے والے عاشق ہیں ۔ کیونکہ وہ اس دنیا کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں ۔وہ اس دنیا کی دکھاوی رنگینی کی حقیقت سے بھی آشنا ہیں ۔اسی لئے تو وہ لکھتے ہیں :

تو خود میں اکیلا ہے
تیرے دم سے مگر
سنسار کا میلا ہے

گر چہ ان کا یہ ماہیا بہت سیدھا سادھا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ماہیا صوفیانہ شاعری کی بھر پور عکاسی کرتا ہے ۔چونکہ صوفیا کرام نے نظریہ توحید کے زیر اثر اسی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس دنیا میں اگر کوئی سچّائی ہے تو وہ صرف اور صرف 'خدا' کی ذات ہے ۔اس کے علاوہ اس دنیا کی ساری چیزیں صرف دھوکہ ہیں اور مایا ہیں ۔ ۔شاید اسی لئے حیدر قریشی اس دنیاوی بلندی وپستی کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمیشہ آگے بڑھتے رہتے ہیں ۔

حیدر قریشی اردو ماہیا کو فنی پختگی عطا کرنے والے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ماہئے کے ایک اچھے ناقد بھی ہیں ۔اس لئے ان کی ماہیا نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے وقت ان کی ماہیا نگاری کی تمام خصوصیات کے علاوہ ماہیا نگاری پر ان کی جد و جہد سے گفتگو کئے بغیر یہ مضمون ادھورا معلوم ہوگا ۔ اس لئے چند جملے ان کی جد و جہد کی نذر کرتا ہوں ۔جیسا کہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ایک طویل عرصے تک ''ماہیے'' کے ہیت کو لے کر بحث ہوتی رہی ہے لیکن حیدر قریشی سے قبل کوئی بھی اس صنف کے ساتھ انصاف نہیں کر پایا ۔انھوں نے ماہیے کے حوالے سے ایک پختہ تحقیقی کارنامہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ اس فن کو پوری طرح اردو میں مروج کرنے کے لئے خود بھی ماہیا لکھا اور خوب لکھا ۔حیدر قریشی سے قبل اردو ماہیا کے اوزان کے متعلق ایک مستحکم بحث نہیں ہو پائی ، شاید اسی لئے ایک طویل عرصے تک اردو میں غلط اوزان پر ماہیے لکھے جانے کی روش چل پڑی تھی ، لیکن حیدر قریشی نے اس بات کو اچھی طرح سے واضح کیا کہ ماہیا کے درست اوزان کے مطابق دوسرے مصرعے میں ایک سبب یعنی دو حرف کم ہوتے ہیں ۔مثال ملاحظہ ہوں ۔

فعلن فعلن فعلن	مستی سے بھری پیلی
فعلن فعلن فع	الھڑ مٹیاریں
فعلن فعلن فعلن	جب کھیل گئی گلی

اس کی ایک اور بھی شکل ہوتی ہے......

مفعول مفاعلین	تختی کو سکھاتے تھے
فعل مفاعلین	خواب سہانے تھے
مفعول مفاعلین	پر دل کو دُکھاتے تھے

اس طرح حیدر قریشی نے اردو شاعری میں صرف ماہیا نگاری کی با قاعدہ بنیاد ہی نہیں ڈالی بلکہ وہ اس کے میر کارواں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان کی ادبی خدمات کا سرمایہ ان کے ماہیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو سے معطر ہے۔اردو ماہیا نہ صرف محبوب کے ہجر و وصال تک محدود رہا بلکہ حیدر قریشی نے طرح طرح کے تجربے کر کے اس کے موضوعات کو بہت وسعت بخشی۔ان کے ماہیوں میں محبوب کی جدائی کے علاوہ ،حمد ،نعت، شادی بیاہ کے جذبات ، وطن کی محبت،رشتہ داری کے مختلف روپ وغیرہ طرح طرح کے موضوعات کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ان تمام موضوعات پر مشتمل ماہیوں کی ایک ایک مثال ملاحظہ ہو۔

تو خود میں اکیلا ہے
تیرے دم سے مگر
سنسار کا میلا ہے

دنیا پہ کرم کر دے
پیار کی سینوں میں
پھر روشنیاں بھر دے

برگد کی جٹائیں ہیں
ساتھ مرے اب بھی
ابو کی دعائیں ہیں

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
میری گزری جوانی ہے

وہ نین غزالی تھے
فیصلہ کیا ہوتا
سب ان کے سوالی تھے

نیت تھی میری کھوٹی
تم بھی تھے آمادہ
اور کھلتی گئی چوٹی

عہد حاضر کی ادبی محفلوں میں حیدر قریشی کا نام بار ہا لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیدر قریشی کسی ایک صنف کی زلف پیچاں میں گرفتار نہیں ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی بلکہ مختلف نثری اصناف میں بھی تخلیقی کارنامہ انجام دیا۔ ظاہر سی بات ہے جو شخص ایک ساتھ اتنی خدمات انجام دے رہا ہو اس کا نام کس ادبی محفل سے خارج کیا جا سکتا ہے، منعقدہ ادبی محفل خواہ شعر و شاعری کے حوالے سے ہو، خواہ تنقید یا عصری ادبی مسائل کے حوالے سے ہو۔ اس لئے جب میں نے اپنا مضمون ''حیدر قریشی بنام اردو شاعری'' لکھنا چاہا تو ان کی غزل گوئی اور نظم نگاری کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہو سکا۔ لہٰذا اس مضمون کے دوسرے حصے میں ان کی غزل گوئی کے حوالے سے اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

حیدر قریشی کی غزل گوئی پر قلم اٹھانے سے قبل میں یہ کہنا چاہتا ہوں حیدر قریشی کی شخصیت خود ایک حسین غزل کا مرقع ہے۔جس طرح سے غزل مختلف موضوعات پر مشتمل اشعار سے تیار شدہ ایک حسین گلدستہ نظر آتی ہے،اسی طرح سے حیدر قریشی کی دست رس اردو کے مختلف اصناف پر مکمل طور سے ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت اسی طرح سے خوبصورت اور حسین نظر آتی ہے جیسے کہ ایک گلدستہ نما غزل۔جس شاعر کی شخصیت اس قدر حسین اور خوبصورت ہو اس کی شاعری کے بارے میں کیا کہنا۔حیدر قریشی کی زندگی کے تجربات و مشاہدات ان کی غزلوں میں بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔ان کی غزلیں کسی ایک موضوع کے ارد گرد نہیں گھومتی۔ان کی غزلوں میں ایک سے بڑھ کر ایک عشقیہ اشعار بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ ان کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات پر مشتمل اشعار بھی۔انھوں نے کسی خاص موضوع کی تلاش میں وقت برباد نہیں کیا ہے بلکہ تمام اعلیٰ درجے کے شاعروں کی طرح اپنے گرد و نواح میں پھیلے تمام موضوعات کو اپنی غزلوں میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔حیدر قریشی کے لئے ان موضوعات کو اپنی غزل میں اس قدر کامیابی کسے ساتھ پیش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ جو شخص ماہیے کے ڈیڑھ مصرعے میں پنی بات پوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لئے غزل کے دو مصرے کافی ہیں۔غور کرنے کی بات ہے کہ جب کوئی چوزہ انڈے سے باہر گھونسلے کو اپنا نیا گھر پاتا ہے تو اس کے حرکات و سکنات مزید بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب حیدر قریشی ماہیے سے نکل کر غزل کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ان کے خیالات کی پرواز تیز ہو جاتی ہے۔ایسے میں ان کے قلم سے اس طرح کے اشعار نکلتے ہیں۔

پہلے سے بھی بڑھتے ہیں صرف مسئلے حیدر
جھوٹ بولنے سے کب انقلاب آتا ہے

میں کوئی رامؔ نہ گوتمؔ، حیدرؔ اک شاعر آوارہ

پھر یہ کیسی خواہش ہے جنگل میں لے لوں جوگ

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی اگر میں چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اگے

لفظ اندھے ہو گئے سوچوں کو پتھر کر گیا
ایک ہریالی کا پیکر دل کو بنجر کر گیا

تو کیوں نہ مل لیں ہم اک دوسرے کو جی بھر کے
یہ جب یقیں ہے کہ اک دن ہمیں بچھڑنا ہے

یہ ان کی ابتدائی غزلوں سے منتخب چند اشعار ہیں اور انھیں پڑھ کر کون کہے گا یہ کسی نو وارد شاعر کا کلام ہے ۔جس طرح سے ان کی فکر میں گہرائی اور سوچ میں بلندی ہے اسی طرح سے ان کے مشاہدات بھی دقیق ہیں۔ان کے خیال کی پرواز آسمان سے بھی بلند نظر آتی ہے۔ ایک عام شاعر 'اندھے لفظ' اور 'پتھر سوچ' کی اصطلاح اتنی کامیابی سے نہیں استعمال کر سکتا۔ ان کی کامیاب شاعری کی دلیل پیش کرنے کے لئے محض یہ دو لفظ کافی ہیں۔اردو غزل اپنے خوبصورت اور حسین عشقیہ پیراہن کے سبب جانی جاتی ہے۔اس صنف میں تمام موضوعات کو غزل کے مروجہ اصطلاحوں کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے ۔ چونکہ عشق و عاشقی کا پیکر ہر دل عزیز ہوتا ہے۔اس لئے غزل کے پیراہن میں کہی گئی باتیں بھی دلکش اور حسین ہو جاتی ہیں۔حیدر قریشی نے غزل کے دامن کو اور بھی وسیع کرتے ہوئے اس میں محبوب کے رشتے کے علاوہ تمام انسانی رشتوں کو جگہ دی۔ان تمام رشتوں کو وہ اپنے اشعار میں بہت ہی حسین اور دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔مثال ملاحظہ ہو۔

حیدؔر اب اپنی عادتیں اطوار ٹھیک کر

ابا بھی چل بسے تری ماں بھی نہیں رہی

کاروبارِعشق سے مل جائیں گی پھر فرصتیں
چند برسوں تک مِرا بیٹا جواں ہونے کو ہے

اپنا نہیں تو بچوں کا احساس کر ذرا
حیدؔر ادب کو چھوڑ کے فکر معاش کر

ان کی شاعری میں اس طرح کے اشعار بہت ہی خوبصورتی سے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں محض خیالی پلاؤ نہیں پکائے جاتے بلکہ ان کی شاعری فکر و فلسفے سے معمور ہے۔وہ صرف حسینوں کی قصیدہ خوانی نہیں کرتے پھرتے بلکہ وہ اس سماج کو اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔اپنی زندگی سے حاصل ایک ایک تجربے کو وہ اپنی شاعری میں بہت ہی فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔لیکن وہ غزل کی نذاکت کا بھی بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ اپنے خیالوں کو پیش کرنے کی واسطے وہ اس کی خوبیوں کو مسمار نہیں کرتے۔حیدر قریشی کی غزلوں میں محبت کے مختلف پیکر کی عکاسی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں عاشق روتا ،تڑپتا ضرور ہے لیکن وہ محو یاس نہیں رہتا۔ان کی شاعری میں عاشق تھک ہار کر بیٹھ نہیں جاتا بلکہ وہ اپنے گزشتہ کارناموں سے سبق حاصل کرکے مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے اور اپنے زندگی کی قندیل کو پھر سے روشن کرتا ہے۔جبکہ روایتی شاعری میں عاشق اپنا سب کچھ برباد کرکے مجنوں کی کیفیت میں در بدر کی ٹھوکریں کھانا زیادہ پسند کرتا ہے۔حیدر قریشی اس روایتی عشق وعاشقی سے بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔وہ اپنی طاقت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اپنی منزل کی طرف مسلسل آگے بڑھتے رہتے ہیں۔مثال ملاحظہ ہو۔

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اگے

وہ پتھر دل سہی لیکن ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے
ہمارے لب جنھیں چھو لیں وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

حیدر قریشی کی شاعری میں موضوعات اور فکر کی ندرت کے ساتھ ساتھ نئی نئی اصطلاحات بھی نظر آتے ہیں ۔ وہ اپنی بات کہنے کے لئے صرف رسمی اور فرسودہ Techniques کی مدد نہیں لیتے بلکہ خود بھی نئی اصطلاحیں اور Techniques ایجاد کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ بالکل نو آموز نہیں معلوم ہوتے۔ الفاظ کا انتخاب اور اس کا صحیح استعمال غزل کی خوبصرتی کو عیاں کرتا ہے۔خوبصورت الفاظ کا خوبصورتی سے استعمال غزل میں روانی اور نغمگی پیدا کرتا ہے جو کہ اردو غزل کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔مثال ملاحظہ ہو۔

لفظ اندھے ہو گئے سوچوں کو پتھر کر گیا
اک ہریالی کا پیکر دل کو بنجر کر گیا

اک ایک لفظ ہو گیا ہو بانجھ جس طرح
سوکھے ہیں یوں معانی کتابوں کی جھیل میں

پہلے شعر میں شاعر نے نئی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ صنعت تضاد کا بھی بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔''ایک ہریالی کا پیکر دل کو بنجر کر گیا'' ایک ہی مصرعے میں شاعر نے ہریالی اور بنجر کا لفظ بہت ہی چابک دستی سے کیا ہے۔دوسرے شعر کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر کوئی عام شاعر نہیں ہے بلکہ وہ اتنا اعلیٰ درجے کا شاعر ہے کہ اس کی فکر و خیالات کو ادا کرنے سے اردو شاعری کی Dicton قاصر ہے ۔ یہ شعر شاعر کی فکر اور سوچ کی بلندی کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ ساتھ شاعر کی بلند قد و قامت کی دلیل بھی پیش کرتا ہے۔

ایک اچھا شاعر غزل کی نذاکت کا بھی بھرپور خیال رکھتا ہے۔کوئی بھی بات کتنی ہی انقلابی کیوں نہ ہو لیکن جب کوئی غزل کا شاعر اسے اپنے اشعار میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے

تو اس سلیقے سے اور اس نذاکت کے ساتھ کہ شعر معنی خیز ہونے کے ساتھ ساتھ اثر انگیزی بھی رکھتا ہے اور جہاں کہیں بھی عاشق اور معشوق کے درمیان کی راز و نیاز کی باتیں پیش کرتا ہے تو وہ بھی اس سلیقے کے ساتھ کہ نہ تو اس میں کہیں عریانیت نظر آتی ہے اور نہ ہی گھن گرز کی کی آواز۔حیدر قریشی بھی اس میدان کے شہہ سوار معلوم ہوتے ہیں۔ان کے یہاں زندگی کی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ عشق کے مختلف پہلوؤں کا بیان بھی بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔مثال ملاحظہ ہو۔

بس مسکرا کے پیار سے انکار کر گئے
اچھی طرح سے ان کو مکرنا نہ آ سکا

اس مضمون کے گذشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حیدر قریشی کے افکار و خیالات ماہیے سے نظم تک آتے آتے اس قدر آزاد ہوتے نظر آتے ہیں جیسے کوئی چڑیا پہلے انڈے کو اپنا گھر سمجھتی ہے، پھر گھونسلے کو اور آخر کار آسمان کو لیکن یہ چڑیا کسی بھی صورت حال میں اپنے گھر کو غیر مناسب نہیں سمجھتی ہے بلکہ ہر گھر میں اپنے ہاتھ پاؤں مکمل طور سے چلاتی ہے۔اسی طرح حیدر قریشی ماہیا کی دنیا میں رہ کر اپنے افکار و خیالات کو پیش کرنے کی لئے کسی طرح کی قید و بند نہیں محسوس کرتے، بلکہ وہ اس میدان میں بھی اپنی فنی چابکدستی کا ہنر دکھاتے ہیں۔وہ ماہیا کی دنیا میں بھی Polestar کی طرح روشن ہیں اور غزل و نظم کے میدان میں بھی۔جبکہ تینوں اصناف کی ہیت بالکل مختلف ہے، ماہیا میں شاعر کچھ زیادہ ہی بندھا ٹکا محسوس کرتا ہے، غزل میں اسے تھوڑی راحت ملتی ہے لیکن نظم میں وہ پوری طرح آزاد ہو جاتا ہے۔نظم میں شاعر دل کھول کر پوری آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔نظم میں شاعر کو وہ ماہیا اور غزل کی طرح ہیتی قید و بند سے راحت مل جاتی ہے۔حیدر قریشی کا کمال یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات ماہیے کی ہیتی تنگی میں نہ تو سمٹتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی نظم کی آزاد فضا میں بکھرتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی کہیں ان کا انداز مخلوط نظر آتا ہے۔حیدر قریشی کی پوری شاعری میں کہیں کچھ یکساں نظر آتا ہے تو صرف اور صرف موضوع، باقی غزل، نظم اور ماہیا تینوں اپنی

خصوصیات کی حامل ہیں۔

اردو شاعری میں نظم ایک ایسی صنف ہے جس میں شاعر اپنی باتوں کو کسی ایک موضوع کے تحت مسلسل بیان کرتا ہے۔ یعنی وہ اپنے افکار و خیالات کو ایک تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔حیدر قریشی نے آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ گرچہ آزاد نظموں میں غزل اور ماہیے کی طرح مصرعوں میں الفاظ کی تعداد میں کسی قدر پابندی نہیں ہوتی لیکن اس کے بھی اپنے اصول و ضوابط ہوتے ہیں اور شاعر ان فنی اصولوں کو پورا کرکے ہی ایک کامیاب نظم تخلیق کر سکتا ہے۔ حیدر قریشی کا تخیل نظم کی آزادی کے ساتھ بے راہ روی کی طرف بہتا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ یہ مکمل طور سے فنی چابکدستی کے دائرے میں رہتا ہے ۔ان کی نظموں میں ابتداء اور ارتقاء دونوں اثر انگیز ہوتے ہیں اور درمیانی حصہ بھی کسی قدر کم تر نہیں ہوتا۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سے ایک غزل گو شاعر مطلع سے مقطع تک پہنچتے پہنچتے بچہ سے جوان ہو جاتا ہے اور اس کے خیالات پختہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح حیدر قریشی اپنی شاعری کے سفر میں نظم تک آتے آتے ایک اعلیٰ درجے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

حیدر قریشی نے ادب کے جس بھی فن پارے کو ہاتھ لگایا اس میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ۔ انھوں نے اپنی نظموں میں خود سے لے کر خدا تک کی بات پیش کی ہے ۔مثلاً وہ عام انسانوں کی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ مومن کے جیسے افکار کا بھی ذکر اپنی نظموں کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جہاں ایک طرف انسانوں کے دکھ درد نظر آتے ہیں وہیں فطرت کی بھی حسین عکاسی نظر آتی ہے ۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنی نظموں میں اس سماج کے مختلف طبقوں کے مسائل کی بھی عکاسی کی ہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے انسانی زندگی کا بغور مطالعہ کرکے فطرت سے اس کے رشتوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کی بہترین نظموں میں درد، ایک اداس کہانی ، چاند کی تسخیر کے بعد، میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا ، ایبٹ آباد، منی پلانٹ، یہ دل اور ایک دراوڑ کا پیغام آریوں کے نام وغیرہ کا شمار کیا جا سکتا ہے ۔ان کی یہ نظمیں صرف عشق و عاشقی کی دنیا کی سیر نہیں کراتی بلکہ فطرت اور انسانوں کی حقیقی زندگی کے تمام رنگوں کو بھی بہت ہی دلکش انداز میں ہمارے سامنے لاتی ہیں۔

ان کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ روایتی نظموں کی طرح کسی ایک منظر کا بیان نہیں کرتی بلکہ ان کی نظمیں ایک ''مونتاژ'' کی سی کیفیت رکھتی ہیں ۔ وہ اپنی نظموں میں مختلف مناظر کو یکجا کر کے ایک نیا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کی نظم ''درد'' اس کی بہترین مثال ہے ۔اس نظم کے پہلے بند میں انھوں نے گہرے سناٹے میں کالے انجن کی آواز کا ذکر کیا ہے، دوسرے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ، تیسرے میں چوڑیوں کی چھنک اور چوتھے میں بانسری کی دکھ بھری آواز کا۔لیکن انھوں نے ان تمام مناظر کو یکجا کر کے ایک ایسی درد بھری آواز سے تعبیر دی ہے جو اس کے ماں جائے ہیں۔مثال ملاحظہ ہو ۔

یہ ساری صدائیں مری آشنا ہیں
مجھے جانتی ہیں
میں ان سب کو پہچانتا ہوں
متاعِ فقیراں۔۔۔۔۔۔
یہ سب میرے دردوں کی آواز ہیں
درد
جو میرے مونس ہیں
ماں جائے ہیں!

حیدر قریشی کو اس نظم میں تمام آوازوں کے درمیان ایک ایسی آواز سنائی دیتی ہے جس میں انھیں اپنے پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہ آوازیں انھیں ایک ایسے درد کا احساس دلاتی ہیں جن سے ان کا پرانا رشتہ ہے ۔ان تمام آوازوں کے درمیان انھیں ایک درد اور ٹیس بھری آواز سنائی دیتی ہے اور یہی درد بھری آواز ان تمام آوازوں کو یکجا کر کے ایک ایسا تاثر قائم کرتی ہے جو قاری کے ذہن پر ایک دیر پا اثر چھوڑتی ہے۔ یہ نظم قاری کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ قاری اس طرح کی آوازوں میں اس درد کی تلاش کرنے لگتا ہے۔غور کی بات یہ ہے کہ یہ درد بھری آوازیں مشینی زندگی کی ہیں۔حیدر قریشی نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے کہ ۔

صدا جھنکار اور چہکار کی صورت
رگ جاں تک اترتی ہے، لہو میں بولتی ہے
روح میں رس گھولتی ہے
مگر دل میں نہیں آتی
کہ دل کے دیس میں آنے کے سارے راستے
آنکھوں سے آتے ہیں (ایک اداس کہانی)

'درد' اور 'ایک اداس کہانی' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر قریشی مشینی اور نیچرل آوازوں میں اختلاف رکھتے ہیں کیوں کہ ان کی اولالذکر نظم میں مشینی آوازوں کی نشاندہی ہوئی ہے اور دوسری نظم میں نیچرل آوازوں کی۔ پہلی نظم میں وہ لکھتے ہیں کہ'' یہ سب مرے دردوں کی آواز ہیں'' اور دوسری نظم میں لکھتے ہیں کہ'' روح میں رس گھول دیتی ہے''۔ یہ دونوں مصرعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حیدر قریشی اس دنیا کی بناوٹی رنگینیوں میں نہیں گم ہونا چاہتے بلکہ وہ حقیقی زندگی یعنی فطرت کے قریب رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

حیدر قریشی اپنے تخلیقی کارناموں میں بھی اپنی تنقیدی صلاحیت کا استعمال کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح ایک نقاد کسی فن پارے کی اچھائی اور برائی دونوں کو اجاگر کرکے اس فن پارے کی اہمیت و افادیت کا تعین کرتا ہے۔ حیدر قریشی نے اپنی ایک نظم 'ہوا' میں اس فن کا بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے پہلے ہوا کی تلخیوں کو بہت ہی تفصیل سے بیان کیا ہے اور پھر ہوا سے متعلق ایک ایسی حقیقت کا بیان کیا ہے جس سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ اس نظم کی ابتداء میں انھوں نے 'ہوا' کو ناگن اور ڈائن کہا ہے اور اس کے تمام برے کارناموں کو گنوایا ہے لیکن آخر میں لکھتے ہیں کہ

ذرا پھر دل کے دریا میں اتر کر
اپنی نم آنکھوں سے تھوڑا مسکراؤ

اور پھر سوچو!
زمیں، پانی، فضاؤں تک
جہاں بھی زندگی ہے
اس ہوا کی حکمرانی ہے
ہوا نہ ہوا گر تو زندگی معدوم ہو جائے............

حیدر قریشی کی نظمیں کسی ساکت محفل کی عکاسی نہیں کرتیں بلکہ ان کی نظموں میں حقیقی زندگی کے حرکات وسکنات پائے جاتے ہیں۔ان کی نظموں میں ایک ایسی حقیقت بیان ہوتی ہے جو ہمارے ذہن کو بیدار اور دماغ کو روشن کر دیتی ہے۔ان کی نظموں میں ایک ایسا فلسفہ پیش ہوتا ہے جو ہمیں اپنی زندگی میں توازن برقرار رکھنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔کیونکہ دنیا کی کوئی بھی شے ایک جگہ ساکت رہ کر نہ تو ترقی کر سکتی ہے اور نہ ہی زندہ رہ سکتی ہے۔زندگی کی اس حقیقت کے علاوہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انسان کا دل جذبۂ عشق سے معمور ہوتا ہے۔اس لئے اس کا یہ جذبہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور نمودار ہوتا ہے۔حیدر قریشی کی نظموں میں عشقیہ جذبات کی عکاسی بہت خوبصورتی سے ہوئی ہے۔چونکہ شاعری میں عشقیہ معاملات کو پیش کرنے کے لئے بہت ہی نرم و نازک الفاظ و اصطلاحات کی ضرورت ہوتی ہے۔حیدر قریشی نے جس طریقے سے دیگر مسائل کو بہت ہی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے اسی طریقے سے عشقیہ جذبات کو بھی بہت ہی نرم و نازک لہجے میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔مثال ملاحظہ ہو۔

سنو جاناں!
اب اپنے حسن کے رنگوں سے میری شاعری بھر دو
اب اپنی آنکھ کے جادو کے سارے اسم
مجھ پر کھول کر
مجھ کو طلسم حرف کے اسرار سکھلاؤ

مرے معنی مرے مفہوم بھی مجھ کو عطا کر دو
مرے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دو
نزدیک آ جاؤ!

یہ ہے نرم و نازک خیالات کو نرم و نازک انداز میں پیش کرنے کا نام۔حیدر قریشی اپنے محبوب کو اپنے پاس بلانے کے لیئے یکا یک ایک جملہ نہیں استعمال کرتے ہیں بلکہ انھوں نے محبت کے مختلف وسائل کو استعمال کرتے ہوئے محبوب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس طرح انھوں نے عشقیہ جذبات کے ساتھ نہ صرف پارسائی کی ہے بلکہ اردو نظم نگاری میں بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔

☆☆☆

میرزا ادیب (لاہور)

حیدر قریشی مجھ سے دُور بھی ہیں اور قریب بھی ۔ دُور زمینی فاصلے کے لحاظ سے ، اور قریب اس محبت اور خلوص کی بنا پر جو وہ میری ذات کے لئے روا رکھتے ہیں،مگر کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب وہ میرے بہت ہی قریب آجاتے ہیں ، یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جب میں اُ ن کی کسی تڑپا دینے والے والی تخلیق کا مطالعہ کرتا ہوں ، یہ تخلیق بالعموم شعری صورت میں ہوتی ہے۔ حیدر قریشی نے اپنی ذہانت کا ثبوت کئی صورتوں میں دیا ہے ، وہ ایک شاعر بھی ہیں ، افسانہ نگار بھی ، اور ان کے علاوہ ایک مدیر بھی۔ مجھے ان کی ساری صلاحیتوں نے متاثر کیا ہے ،مگر میں جب معروضی انداز میں ان کا تجزیہ کرتا ہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری نظروں میں ان کی غزل ان کے تخلیقی جوہر کی خصوصی مظہر ہے ۔ان کے بعض غزلیہ شعروں نے مجھے حزن و ملال کی کیفیت سے بھی دو چار کیا ہے مگر ایسی کیفیت کے اندر بھی اپنا ایک سرور ہوتا ہے۔ یہ سرور درسرور قسم کی کیفیت سے عبارت ہے۔اس کی وضاحت نہیں ہوسکتی ۔ میں نے حیدر کے جب یہ شعر پڑھے تھے تو میری آنکھیں بے اختیار نم ناک ہوگئی تھیں:

یہ ساری روشنی حیدرؔ ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

عشق اور نوکری مل کر دونوں چوس گئے ہیں تجھ کو
تُو تو بس اب ایسے ہے جیسے گنے کا پھوگ

دوسرے شعر پر شاید کچھ اہل ذوق ناک بھول چڑھائیں ،لیکن میں سمجھتا ہوں حیدر نے نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کے ایک عمومی پہلو کا اظہار دل میں اُتر جانے والے انداز سے کر دیا ہے۔ گنے کا پھوگ ایک ایسی مثال ہے جو میں نے پہلی بار ایک شعر میں دیکھی ہے ۔حیدر کے اور بھی کچھ اشعار ایسے ہیں جن کے متعلق میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ

انھیں گنگنانے کو بے اختیار جی چاہا اور اکثر گنگنا تا رہا:

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدؔر
پھر مرا شوق سفر مجھ کو چرا لایا تھا

خوشی حد سے زیادہ دے کے بھی بر باد کرتا ہے
انوکھے ہی ستم دل پر ستم ایجا د کرتا ہے

اور یہ شعر تو قیامت کا شعر ہے:

غم تمہارا نہیں جاناں ہمیں دُکھ اپنا ہے
تم بچھڑتے ہوتو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں

آ ج حیدر قریشی اپنا پہلا شعری مجموعہ دنیائے ادب کو دے رہے ہیں ، میں اُن کے اس مجموعے کا خیر مقدم کرنے والوں میں بصد مسرت شامل ہوں!

(حیدر قریشی کے پہلے شعری مجموعہ کی اشاعت کے موقعہ پر لکھی گئی

۱۹۹۱ء کی تحریر)

☆☆☆

"عمر گریزاں" کی شاعری

مظہر امام (دہلی)

معاصر شاعری میں تازہ کاری اور تازہ دمی کی ایک نمایاں مثال حیدر قریشی اور ان کا کلا م ہے۔آج کی شاعری پر ایک الزام یہ ہے کہ اس میں یکسانیت اور یک رنگی در آئی ہے ۔ ایک ہی طرح کی علامتیں،استعارے،لفظیات ، وہی پیش پا افتادہ باتیں جو ایک مخصوص عصر کی پہچان کے لئے بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ یہ الزام صرف موجودہ شاعری پر ہی عائد ہوسکتا ہے یا ہر زمانے میں تقلیدی متشاعروں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ سردست میں آج کی شاعری پر فرد جرم عائد کرنے والوں سے حیدر قریشی کے کلام کے مطالعے کی سفارش کروں گا کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ حیدر قریشی کے استعارے ، علامتیں، لفظیات اور موضوعات دوسرں سے الگ دکھائی دیتے ہیں یا نہیں؟

حیدر قریشی نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل گوئی سے تو ان کی بنیادی دلچسپی ہے ہی (ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ " سلگتے خواب" شائع ہو چکا ہے) لیکن انہوں نے نظمیں بھی بہت اچھی کہی ہیں اور بعض نظموں کو پڑھ کر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوا کہ وہ غزل کے زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نظم کے ۔حیدر قریشی کا نام آزاد غزل سے بھی جڑا ہوا ہے۔ جب وہ ہونہار اور دلنواز شاعرہ فرحت نواز کے اشتراک سے اردو کا ایک نہایت عمدہ رسالہ" جدید ادب" کے نام سے شائع کر رہے تھے تو اس میں انہوں نے کئی فکر انگیز مباحث کی طرح ڈالی تھی۔ اور کئی بار آزاد غزل کے خصوصی گوشے بھی شائع کئے تھے۔ انہوں نے آزاد غزل کی ماہیت کے تعلق سے اپنے رسالے میں ایک ادارتی نوٹ لکھا۔خود بھی آزاد غزلیں کہیں اور فرحت نواز اور دوسرے دوستوں کو آزاد غزل کہنے کے لئے آمادہ کیا۔ اس صنف کو پاکستان میں متعارف کرانے اور مقبول بنانے میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ ادھر انہوں نے اتنی بڑی تعداد میں ماہیے لکھے ہیں اور ماہیے کی صنف کی عروضی حیثیت پر مباحث

میں اس طرح حصہ لیا ہے کہ اب ان کی شناخت ماہیے کے بغیر نامکمل ہے اور ماہیے کی شناخت ان کے بغیر۔

حیدر قریشی کی غزلوں کے اشعار پڑھتے ہوئے اکثر مجھے احساس ہوا کہ ان کے پردے سے ایک مربوط تمثیلی منظر نامہ سامنے آرہا ہے۔

کردار فقیہاں، مری آزادہ روی بھی
" گم راہی " کے لیکن یہی اسباب نہیں تھے
اس بزم میں ہر جھوٹ پہ بول اٹھتے تھے فوراً
نادان تھے ہم، واقف آداب نہیں تھے
ہر گوہر نایاب کی تذلیل بجا ہے
پر ہم تو کوئی گوہر نایاب نہیں تھے
احباب کے تیروں کے تو ہم عادی تھے حیدرؔ
اس بار مگر بھائی تھے، احباب نہیں تھے

اکثر اشعار میں جبر کے ماحول سے رہائی پانے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ جبر کی نوعیت کیا ہے، سیاسی، معاشرتی یا مذہبی ؟ شاید مذہبی تنگ نظری کا پیدا کردہ جبری ماحول ۔ حیدرقریشی اپنا موقف اس طرح واضح کرتے ہیں۔

قریش مکہ میں ہو یا مدینہ والوں میں
فقیر نسبت ارض حجاز رکھتا ہے

اور رسول اکرم ﷺ کے ایک بیان سے استفادہ کر کے کیا بلیغ شعر کہتے ہیں۔

کوئی یہ کہہ دے مرے دشمنوں سے اے حیدر!
مرے خدا نے تمہارے خدا کو مار دیا

حیدرقریشی کا ایک سادہ سا شعر ہے۔

صرف یہ عمر گریزاں ہی نہیں کرتی اداس
میرا ہنستا ہوا بچپن بھی رلاتا ہے مجھے

لیکن یہ شعر، شعری کردار کی پوری زخمی شخصیت کو، اس کے اندرون کے کرب کو اور اپنے ماحول اور معاشرے سے حاصل کی ہوئی اذیتوں کو مکمل طور پر آئینہ کر دیتا ہے۔ حیدر قریشی کے ذہن وفکر میں جو پیچیدگی اور گہرائی ہے، وہ ان کے تجربات کو کئی معنیاتی امکانات سے آشنا کراتی ہے۔

اس میں مل جائے گا جا کر مرے اندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد

حیدر قریشی کے نزدیک چشم ظاہر کی بھی اہمیت ہے۔ مشاہدے میں آنے والی سامنے کی باتیں، عموماً ہماری شاعری میں بار نہیں پاتیں، حیدر قریشی ان سے اجتناب نہیں برتتے۔ وہ عینک سے آراستہ حسن کو بھی تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

پڑتا ہے یوں تو حسن پہ اس کا اثر، مگر
اچھی لگی ہے آپ کو عینک لگی ہوئی

حیدر قریشی کی نظمیں داخلی تجربات کے شخصی برتاؤ کے حوالے سے ایک الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔ طول کلامی سے احتراز ان کے اسلوب سخن کا ایک بڑا وصف ہے۔ عموماً ان کی نظموں میں ایک خاص نوع کا ارتکاز ملتا ہے۔ ان میں تجربہ واحساس ہی نہیں، مشاہدے کی کارفرمائی بھی قابل لحاظ ہے اور ان کی نظموں کو لطافت اور اثر انگیزی عطا کرتی ہے۔ ان کی نظمیں، ماورائی، مابعد الطبیعاتی اور تجریدی فضاؤں میں پرواز نہیں کرتیں۔ ان کے یہاں ارضی رجحان غالب ہے اور حیات وکائنات کی ٹھوس چیزوں سے ان کا رشتہ گہرا ہے۔

حیدر قریشی کے کلام سے ایک نرم دل جذباتی شخصیت ابھرتی ہے جس کے اندر محبت میں سب کچھ لٹانے اور بہت کچھ پانے کا جذبہ موجزن ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ "سلگتے خواب" میں ایک عجیب وغریب شعر ملتا ہے۔

اس کو پانے کی تمنا پہ یقیں کب ہے مگر
ہاتھ جب اٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگو

شاید یہی وہ کیفیت ہے جسے وزیر آغا نے "غم میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ" کا نام دیا

ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ حیدر قریشی کی شخصیت محبت کے جذبے کو کسی ایک فرد تک محدود نہیں رکھتی خواہ وہ محبوبہ ہی کیوں نہ ہو! وہ محبت کی ہمہ گیری کے قائل ہیں، جو ماں، بیوی، بہن، بھائی بلکہ ساری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ محبت کی یہی وسعت ان کی شخصیت کو توانائی عطا کرتی ہے اور کسی مخصوص مسلک یا عقیدے کے حصار میں مقید ہونے نہیں دیتی۔

اپنی بڑی بہن کے لئے ان کے عقیدت اور محبت کن بلندیوں تک پہنچی ہے اس کا اندازہ اس ایک شعر سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے ہونٹوں کی محراب دعاؤں والی
اس کی خاموشی بھی اذاں جیسی لگتی ہے

اپنی چھوٹی بہن زبیدہ کی رخصتی پر، ان کی، دل گداختہ سے براہ راست نکلی ہوئی نظم کی آخری سطریں دیکھئے۔

مرے چاروں سمت اپنی بہنوں کی سچی محبت
کے پھولوں کی خوشبو بسی ہے
میں اب آنسوؤ ں کا گلا گھونٹنا بھی نہیں چاہتا
کیوں کہ یادوں کی سر سبز وادی میں
بارش کا دل کش نظارہ بھی تو دیکھنا چاہتا ہوں
مگر اب بھی پھر اس گھڑی
جب مری دوسری بہنیں بچھڑیں گی مجھ سے
میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا!

ہماری شاعری میں بیوی سے محبت کا اظہار کم کم ہی ہوا ہے۔ کمار پاشی نے اپنی بیوی کے تعلق سے لکھی ہوئی نظموں کا ایک پورا مجموعہ "اردھانگنی کے نام" سے شائع کیا تھا۔ حیدر قریشی نے اپنی ازدواجی زندگی کے ساڑھے بارہ سال مکمل ہونے پر "نصف سلور جوبلی" کے

نام سے جو نظم کہی ہے وہ ان کے جذبات کی شیفتگی کی آئینہ داری کرتی ہے۔انہوں نے "اردھانگنی" کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی جز وحیات بنا دیا ہے۔

سرشاریاں
شاداب اور سیراب جسم و جان سے چھلکیں
تو آنگن میں بہاریں اور چہکاریں
دمک اٹھیں
شرارت، کھیل، جھگڑا اور
صلح و آشتی، پھر آشتی کے ساتھ ہی جھگڑا
کتابیں، کاپیاں، پنسل، قلم اور ہوم ورک
اتنے شرارت سے بھرے چہروں پہ ایسا نور
یہ معصومیت، پاکیزگی
گنگناتے، کھنکھناتے، جگمگاتے قہقہے
زندگی ہی زندگی

حیدر قریشی انسانوں سے ہی نہیں، بلکہ فطرت سے بھی اسی طرح ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اس کی ایک نہایت خوبصورت مثال ان کی نظم "ایبٹ آباد" ہے، جہاں ایک کالج کے معلم کی حیثیت سے انہوں نے دو سال گذارے ہیں۔ایبٹ آباد دن کے وقت کیسا نظر آتا ہے۔ اور رات کے وقت کیسا اور خود شاعر ان مناظر سے گذرتے ہوئے کیسا محسوس کرتا ہے۔ یہ ساری کیفیتیں اس نظم میں در آئی ہیں۔ یہ چند سطریں دیکھئے۔ ہر چند پوری نظم اس لائق ہے کہ اسے من وعن پیش کیا جائے۔

پہاڑوں کے دامن سے
لپٹی ہوئی
یہ حسین اور سرسبز وادی کہ جیسے
کوئی خوبصورت سی ننھی سی بچی

محبت کا اظہار کرتے ہوئے
ماں کے سینے سے چمٹی ہوئی

☆☆☆

یہ شہر نگاراں ہے یا کوئی
دوشیزہ سلمہ ستارہ کے جوڑے میں
ملبوس شرمیلے پن سے کھڑی ہے
دن اور رات کے وقت ان مناظر کو دیکھ کر خود شاعر کا احساس۔
ایسا لگتا ہے جیسے
فلک کے ستارے ہی یہ
جگمگا تا ہوآسماں لے کے
اس وادیٔ دل نشیں میں
اتر آئے ہیں
یا میں خود آسماں پر
کروڑوں ستاروں کے جھرمٹ میں
چلتا ہوا جا رہا ہوں!

آزاد غزل کو بعض کرم فرماؤں نے اپنی ناموزونیٔ طبع ، غیر شعری مزاج ، بے ذوقی بلکہ بد ذوقی کا شکار بنا رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزاد غزل میں صرف ارکان کم یا زیادہ کرنے کی آزادی ہے۔ باقی پابندی ہی پابندی ہے۔ مثلاً ارکان توڑے نہیں جا سکتے۔ ایک رکن کا کوئی ٹکڑا دوسرے مصرعے کا حصہ نہیں بنایا جا سکتا۔ پھر ایک اہم بات یہ کہ جس طرح آزاد نظم ہر بحر میں نہیں کہی جا سکتی، اسی طرح آزاد غزل بھی ہر بحر میں نہیں کہی جا سکتی۔

حیدر قریشی کی آزاد غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور اس مجموعے میں انہوں نے ایک ہی آزاد غزل شامل کی ہے۔ اس میں اس صنف کے تیکنیکی لوازمات کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے شعری آہنگ کہیں مجروح نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ مطلع۔

تماشہ بن گئے معتوب ہوتے جا رہے ہو
مگر پھر بھی اسی پتھر سے ہی منسوب ہوتے جا رہے ہو

ماہیے کے وزن کے سلسلے میں بحثیں تو بہت ہو رہی ہیں، لیکن میں حیدر قریشی کے موقف سے اتفاق کرتا ہوں کہ ماہیا بنیادی طور پر گائی جانے والی لوک شاعری ہے اور اس کی مخصوص دھنیں ہیں، اور ان دھنوں کے مطابق ماہیے کے تینوں مصرعے مساوی الوزن نہیں ہوتے۔ پہلا اور تیسرا مصرع ہم وزن بھی ہوتا ہے اور ہم قافیہ بھی۔ لیکن دوسرا نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے، یعنی اس میں ایک "سبب" کی کمی ہوتی ہے۔

اردو میں تین مصرعوں کی نظمیں کہی جاتی رہی ہیں۔ اس طرح کی ایک صورت ثلاثی ہے جس میں تینوں مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں۔ ان دنوں اردو میں ہائیکو کا بہت رواج ہے۔ اس جاپانی صنف کے اوزان کی پوری طرح پابندی کرنا اردو میں ممکن نہیں ہے۔ اس پر اتفاق رائے ہے کہ ہائیکو کے پہلے اور تیسرے مصرعے میں پانچ سالمے(Syllables) ہوں گے اور دوسرے مصرعے میں سات۔ اردو عروض میں "سالمے" کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بہر حال، ماہیے کے برعکس (اس کی دھن سے قطع نظر) ہائیکو کا دوسرا مصرع پہلے اور تیسرے مصرعے سے بڑا ہوتا ہے۔

ماہیا کو حیدر قریشی " کتاب دل" قرار دیتے ہیں۔ ان کے ماہیے گویا اسی کتاب دل کی تفسیریں ہیں۔ ان کے بہت سے ماہیے بڑے دلکش اور دل پسند ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں پانچ ماہیے، جن کے عنوانات دیئے گئے ہیں، ان کے ماہیوں کے بارے میں ایک رائے قائم کرنے میں ممد ہوں گے۔

بیٹے

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
مری گذری جوانی ہے

بیٹیاں

مری چڑیوں کی جوڑی ہے
اک پہلوٹھی کی
اک پیٹ کھروڑی ہے

بیوی

اک روح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

وہ:

سونے کی انگوٹھی ہے
پیار میں سچی ہے
پر قول کی جھوٹی ہے

خود:

جسموں کی اداسی ہے
جسم ہے آسودہ
پر روح تو پیاسی ہے

حیدر قریشی کی غزل ہو یا نظم، آزاد غزل ہو یا ماہیا۔ سب گزرتے لمحوں کو گرفت میں لینے کی کوششیں ہیں۔ "عمر گریزاں" ان کوششوں کی کامیابی کا اشاریہ ہے!

(مطبوعہ سہ ماہی **ادبِ عالیہ انٹرنیشنل**۔ وہاڑی، پاکستان۔ شمارہ اپریل تا جون۲۰۰۲ء)

☆☆☆

حیدر قریشی کی غزل

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

جب کسی شاعر کا پہلا مجموعہ شائع ہوتا ہے تو یہ واقعہ اس کے لئے خطرناک بھی ہوسکتا ہے وجہ یہ ہے کہ پہلا مجموعہ کلام یا تو شاعر کو زندہ کر دیتا ہے یا پھر اسے مار دیتا ہے۔ایسے کئی شاعر ہیں جو اپنا پہلا مجموعہ چھپنے تک اچھے بھلے شاعر تھے مگر جیسے ہی مجموعہ شائع ہوا ان کا جادو ٹوٹ گیا۔کیونکہ دو چار پانچ غزلیں تو اچھی ہوسکتی ہیں مگر کتاب کے لئے بڑی تعداد میں اچھی غزلوں یا کم سے کم اچھے شعروں کا ہونا ضروری ہے۔پھر یہ بھی تو دیکھنا ہوتا ہے کہ کتاب کی شکل میں جب شاعر پورے کا پورا سامنے آتا ہے تو اس کا مسئلہ کیا بنتا ہے؟ کس درجے کا بنتا ہے؟ یا بنتا بھی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی مسئلہ نہیں بنتا تو شعر گوئی تفریحِ طبع کا کام تو نہیں۔یہ تو بقول میرؔ صاحب جگر سوزی کا کام ہے۔

حیدر قریشی کا پہلا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے جس کا نام ہے " سلگتے خواب"۔یہ مجموعہ پڑھ کر مجھے پتہ چلا کہ حیدر قریشی کا مسئلہ تو بہت گھمبیر ہے۔جب میں نے اس کا مجموعہ مکمل طور پر پڑھ لیا تو دفعتاً میری زبان پر مولانا حالی کا یہ شعر آ گیا۔

ٹپکتا ہے اشعار حالیؔ سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

حیدر قریشی سادہ دل تو نہیں ہے مگر پھر بھی مبتلا ضرور ہو گیا ہے اس بات کا مجھے یقین ہو گیا ہے۔

حیدر قریشی کا شمار ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ ابھرنے والے شاعروں میں ہوتا ہے اور اسی زمانے سے وہ میرا دوست ہے۔حیدر قریشی کے ہمعصر شاعر اکثر بڑے شہروں میں رہ کر ابھرے ہیں جہاں انھیں نشر و اشاعت کے بڑے ذرائع حاصل ہوئے جبکہ حیدر قریشی کا کمال

یہ ہے کہ وہ ایک بہت چھوٹے شہر خان پور میں رہ کر محض اپنے شعر کے زور سے سامنے آیا اور پھر بڑے زور آور حملوں سے اس نے اپنا لوہا منوایا۔ میں اس کا دوست بھی ہوں اور اس کا قاری بھی۔ رسائل کے ذریعے میں ایک طویل عرصے سے اس کی غزلیں پڑھ رہا ہوں۔ وہ اپنے ہمعصروں میں بہت نمایاں ہے میں اس کی غزل کی شیرینی، لہجے کی بیبا کی اور بے تکلفی کا شروع ہی سے قائل ہوں۔ یہی وہ صفات ہیں جن کے باعث اسکی غزل ہجوم میں سر بلند دکھائی دیتی ہے۔اس نے مسلسل محنت کے ذریعے اپنی غزل پر اپنی شخصیت کا رنگ چڑھایا ہے جس کے باعث اس کی غزل قارئین کے وسیع حلقے میں پہچانی گئی ہے۔بے شمار انتخابات میں اس کی غزل منتخب غزلوں میں شامل کی گئی۔ یہ سب باتیں اس کی غزل کا اعتبار اور وقار ہیں۔مگر اب تک تو مجموعۂ خیال فرد فرد تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اس کی بکھری ہوئی غزلوں کے ذریعے میں نہ جان سکا کہ وہ کہیں مبتلا بھی ہو چکا ہے۔اس کا مجموعہ "سلگتے خواب" پڑھ کر حالؔی کے علاوہ مجھے غالبؔ کا یہ شعر بھی یاد آتا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

حیدر قریشی کی غزلیں پڑھ کر مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ غالبؔ کا یہ سانحہ بھی یاد آیا۔میں ہوں اپنی شکست کی آواز۔۔۔۔پھر ایک پنجابی شاعر نے کہا تھا۔

ساڈی لگدی کسے نہ ویکھی

تے ٹٹ دی نوں جگ جان دا

ایک پنجابی شاعر نے تو صاف کہہ دیا" ٹٹ گئی تڑک کر کے"۔حیدر قریشی کی غزلوں میں مجھے "تڑک کر کے" ٹوٹنے کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہی ہے۔ وہ میرا دوست ہے بیس سال سے، میں تو اسے ایک ہنسوڑ آدمی ہی سمجھتا رہا۔لا ابالی سا، آوارہ مزاج، غیر ذمہ دار،۔۔ حیرت ہے اس نے عشق اتنی ذمہ داری سے کیسے کر لیا؟ وہ تو اس میں گلے گلے تک پھنسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

میں حیدر قریشی کا دوست ہونے کے ناطے اس کے احوال کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوں

مجھے یاد ہے جب وہ خان پور چھوڑ کر نکلا تو اسے اس وقت بھی عشق کا روگ تھا۔مگر عشق کے روگ کے علاوہ کچھ روگ اور بھی تھے اس نے کہا۔

رزق کی تنگی،عشق کا روگ اور لوگ منافق سارے
آؤ ایسے شہر سے حیدرؔ شہر بدر ہو جائیں

پھر کہا اور اپنے آپ ہی سے کہا :

سوچ لو انجام بھی اس عشق کا
چن دیئے جاؤ گے پھر یادوں کے بیچ

یہ شعر پڑھ کر میں نے سوچا کون سی یادوں کے بیچ؟ پھر خیال آیا کیا حیدر قریشی اپنے آپ کو انارکلی جیسی سماجی حیثیت میں محسوس کر رہا ہے؟ کیا اس کی محبوبہ اس سے اتنے سماجی فاصلے پر ہے؟ کچھ بھی صورت حال ہو مگر میں جانتا ہوں بعد میں اس کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تھا اور وہ واقعی یادوں کی دیواروں میں چُن دیا گیا تھا۔

حیدر قریشی کا مجموعہ " سلگتے خواب" ایک ناکام محبت کی شاعری ہے۔مگر اس عشق نے حیدر قریشی کی شاعری کو اردو غزل کی ایک منفرد داستان بنا دیا ہے۔اس کا ایک ایک لفظ اس کے سچے تجربوں کا شعری اظہار ہے۔اس کی غزل میں اتنا رس ہے کہ بعض اوقات وہ ٹپکتا ہوا نہیں بلکہ ہمارے حواس پر برستا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ابتدائے عشق کی واردات پر مشتمل ایک مسلسل غزل دیکھئے،اس میں سرشاری کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔

دو پرندے چہکتے رہے رات بھر
اور بھرتے چھلکتے رہے رات بھر
رات کی رانی آئی کہ تم آئے تھے
دونوں عالم مہکتے رہے رات بھر
سیدھے رستے کو پانے کی دھن میں مگن
کس طرح ہم بہکتے رہے رات بھر
رات بھر وصل کا چاند چمکا کیا

دل سمندر ہمکتے رہے رات بھر
حاصل عمر ٹھہرے ہیں لمحے وہی
جن میں حیدؔر بھٹکتے رہے رات بھر

اسی طرح یہ غزل۔

مرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں کس رُت میں کیسے خواب لگے
نہ پورا سوچ سکوں، چھو سکوں، نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند، کبھی گل، کبھی کتاب لگے
یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے
تمھارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے
ہمیں تو اچھا ہی لگتا رہے گا وہ حیدؔر
بلا سے ہم اسے اچھے لگے، خراب لگے

یا پھر ایسے اشعار:

خود اپنے حسن کے نشے میں چور لگتا ہے
جو سر سے پاؤں تلک رنگ و نور لگتا ہے

حیدؔر جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو یوں لگا
جیسے اتر گیا ہوں شرابوں کی جھیل میں

ایسی عمروں کے پیار تو حیدؔر
جسم و جاں سے لگان مانگتے ہیں

تھی کتنے موسموں کی مہک اس کے جسم میں

سانسوں کی تیز آنچ میں ہم بھیگتے رہے

کہتے ہیں محبت کا تجربہ سب سے بڑی خود اعتمادی عطا کرتا ہے حیدر قریشی کے ہاں بھی اظہار کا بیباک لہجہ اسی خود اعتمادی کی دین ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے۔

وہ پتھر دل سہی، لیکن ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے
ہمارے لب جنہیں چھو لیں وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

بس اس کے بعد ایک کھچاؤ کی سی صورت حال دکھائی دینے لگتی ہے۔

خود اپنے ہونٹوں پہ صدیوں کی پیاس رکھتا ہے
وہ ایک شخص جو مجھ کو اداس رکھتا ہے

حیدر قریشی کی غزل ایک صاحبِ حال شاعر کی غزل ہے۔ اس کے پاس سچے تجربے ہیں۔ زندہ جذبے ہیں اور اپنی بات کہہ دینے کی ہمت ہے، بلکہ ان باتوں سے بڑھ کر یہ کہ اسے فن شعر پر گرفت حاصل ہے۔ اس کے جذبے اظہار کی مشقت کے ہاتھوں مارے نہیں جاتے بلکہ پوری تازگی کے ساتھ شعر کا روپ دھارتے ہیں اور کہیں مجروح نہیں ہوتے۔ تخلیقی عمل ان کا رس نچوڑ نہیں دیتا جیسا کہ ہمارے زمانے میں بعض شاعروں کے ساتھ ہو رہا ہے، بلکہ تخلیقی عمل حیدر قریشی کے جذبوں کی آنچ کو تیز کر دیتا ہے، اس کی کیفیت کو دو چند کر دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا برسوں کا فنی ریاض اس کے شعلۂ تخلیق کو ہوا دینے کے کام آ رہا ہے اور یہ ایک بہت بڑی بات ہے، یہ باتیں میں اسلئے یہاں کہہ رہا ہوں کے اب آگے اس مضمون میں آنے والی مثالیں اب تک کی مثالوں سے اپنی کیفیت کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ یوں بھی۔

پھر کیا رہا جو وصل کی حسرت نکل گئی

تاہم پیش آمدہ صورت حال میرے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے سوال تو یہ ہے کہ شاعر نے کس کس طرح سے اسے اپنی غزل میں سجایا ہے۔

حیدر قریشی کی غزلوں میں ۔۔۔ اور ساری غزلوں میں تعلق کی ایک نئی صورت دکھائی دیتی ہے جو نہ تو ترک تعلق کہلا سکتی ہے نہ ہی بے تعلقی اور نہ ہی اسے تعلق کا کوئی نام دیا جا سکتا

ہے عجیب گومگو کی سی حالت ہے جو حقیقی زندگی کے بہت قریب لگتی ہے۔

عجیب طور طریقے ہیں اس کے بھی حیدرؔ
وہ مجھ سے پیار تو کرتا ہے، پر نہیں کرتا

خواہش وصال یار کی زندہ ہے آج بھی
لیکن یہ پہلے جیسی جواں بھی نہیں رہی
اس کے لبوں پہ میری محبت کے واسطے
انکار بھی نہیں تھا تو ہاں بھی نہیں رہی
رسم وفا تو اگلے زمانوں کی بات ہے
اب اپنے بیچ رسم جہاں بھی نہیں رہی

وصال و ہجر یک جا کر دیئے ہیں
عجیب اب کے ستم ڈھانے لگے ہو

تمہارے عشق میں کس کس طرح خراب ہوئے
رہا نہ عالمِ ہجراں نہ وصل یاب ہوئے

حیدر قریشی کی غزل میں عشق ایک مسئلے کی شکل میں دکھائی دیتا ہے جو حل نہیں ہوتا بلکہ مسلسل الجھتا چلا جاتا ہے۔ یہ حقیقی زندگی سے بہت قریب لگتا ہے۔ یہ برائے بیت نہیں جیسا کہ اکثر شاعروں کے ہاں ہم محسوس کر سکتے ہیں ۔ بلکہ میں یہاں بار بار اس کے لہجے کی سچائی کو بطور گواہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ لفظ جھوٹ بول سکتے ہیں مگر لہجہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ حیدر قریشی کے لہجے میں ایک ناقابل تردید سچائی ہے۔ ایک حقیقی دکھ، ایک سچا کرب، جو کسی المناک تجربے کے نتیجے ہی میں ملتا ہے ۔حیدر قریشی کی غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے تجربے کے ذریعے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے اسے بڑی کامیابی سے غزل کی زبان

میں کہہ دیا ہے!!

اس بدلتی ہوئی واقعاتی صورتوں کی کتنی عمدہ تصویریں اس کے ان اشعار میں ملتی ہیں۔ وہ ایک جذباتی آدمی ہے اس لئے عشق میں پگھلنے کی حالت کونہیں پہنچا۔ بلکہ وہی جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں۔"ٹٹ گئی تڑک کر کے" کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔

سخت پتھر سہی تمہارا دل
لیکن اس پر لکیر بھی ہم ہیں

جو منہ سے بنتا ہے منکر مرا، اسے کہہ دو
کہ حوصلہ ہے تو دل سے بھی منحرف ہو جائے

جواس کے وصل کے حقدار ٹھہرے اور تھے حیدر
ہمیں تو صرف اس کے عشق میں بدنام ہونا تھا

پھر ایک ایسی صورت جب جہاز کنارے کی چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا ہے اور مسافر تیر کر کنارے لگنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب حمد و نعت لکھ کے کماؤں گا کچھ ثواب
وہ کھو گیا جو میری غزل کا غزال ہے

یہ عشق و شق، یہ ساری محبتیں حیدر
مجھے تو سب ترے دل کا فتور لگتا ہے

چھوڑ گئے سب تجھ کو تیری غزلوں والے لوگ
میرے شاعر سب کے دکھ اب تنہا بیٹھا بھوگ

بس اب تو خاک اور راکھ باقی بچی ہوئی ہے
کہ اب نہ رسی، نہ کوئی رسی کا بَل رہاہے

" سلگتے خواب" کی شاعری حیدر قریشی کے مزاج کی آئینہ دار ہے۔ اس شاعری کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ حیدرقریشی کا مسئلہ کیا ہے؟ اور وہ غزلیں کیوں کہہ رہا ہے؟ ان سوالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو حیدرقریشی ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری سچ بولتی ہے اور اپنے جذباتی مسائل کے حوالے سے اپنی پہچان کرواتی ہے۔۔ اس کے مسائل اس کے حقیقی مسائل ہیں اور ان مسائل کو شعری لباس پہنا کر اس نے جدید غزل میں اضافہ کیا ہے۔ یوں اس کا شمار آج کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ بے حد اوریجنل ہے۔ اس لئے اردو کی جدید غزل کو حیدرقریشی جیسے شاعروں کی بہت ضرورت ہے جو اپنے منفرد تجربوں اور نفسی وارداتوں کے ذریعے اس کے دامن پر جذبوں کے نئے نئے چاند سورج سجاتے جائیں!!

(اکبر حمیدی کے مضامین کے مجموعہ ''مضامینِ غیب'' سے لیا گیا)



حیدر قریشی کی نثری و شعری کلیات
جلوہ ءصد رنگ کی عمدہ مثال

ڈاکٹر حامد اشرف (اودگیر)

(کل ہی ''عمرِ لاحاصل کا حاصل''ملی۔اپنی نوعیت کی مجھے پہلی ایسی کتاب لگی جسے افطار سے پہلے اور سحر کرنے کے بعد پڑھنے کو جی چاہے۔سنا ہے کہ مخدومؔ کی کتاب ''سُرخ سویرا'' کو اُن کا کوئی پرستار ''رحل'' پر رکھ کر پڑھتا تھا۔میں سحر اور افطار کے وقت ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کی حقیقت جان رہا ہوں۔ **ڈاکٹر حامد اشرف۔۔۔بنام حیدر قریشی**)



دنیا نے جن ابنائے زمانہ سے علمی و ادبی فیض اٹھایا' جن کے نقد و نظر سے شعر و ادب کی کہکشاں منور ہوئی' جن کی جولانی قلم کی ایک دنیا پرستار بنی' جن کے اذہانِ تخلیق و تحقیق نے یقیں محکم اور عمل پیہم سے اصنافِ شعر و ادب کی راہیں متعین کیں' ان اہلِ قلم میں ایک نام حیدر قریشی کا بھی ہے۔جو' بیک وقت شاعر' ادیب' ناقد' صحافی' ماہیا نگار' سفرنامہ نگار' سوانح نگار' محقق' انشا پرداز و خاکہ نگار' یادنگار و کالم نگار بلکہ' شبدیزِ فن کے شہسوار سمجھے جاتے ہیں۔

معیار پبلی کیشن' دہلی کے زیرِ اہتمام حیدر قریشی کا کل شعری و نثری سرمایہ بعنوان "عمر لاحاصل کا حاصل" ۲۰۰۵ء میں بصورتِ کلیات وعوامی ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں حیدر قریشی کی شاعری' افسانے' خاکے اور یادیں' انشائیے' اور

سفر نامہ سے متعلق (۱۱) گیارہ کتابوں کو' صرف (۲۴۸) صفحات میں پیش کیا گیا ہے' جس کی مجموعی ضخامت بارہ سو صفحات سے کسی طرح کم نہیں تھی۔اردو ادب میں اس طرح کی پیشکش پہلی بار ہوئی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید (پاکستان) کی رائے ملاحظہ ہو:

"(حیدر قریشی) کی پوری زندگی کا تخلیقی اثاثہ "عمر لا حاصل کا حاصل" کے نام سے شائع ہوا ہے' جس میں پانچ شعری مجموعے (سلگتے خواب' عمر گریزاں' دعائے دل' درد سمندر اور محبت کے پھول) اور چھ نثری مجموعے (افسانے: روشنی کی بشارت' قصے کہانیاں) انشائیے (فاصلے قربتیں) سفر نامہ (سوئے حجاز) خاکے (میری محبتیں اور کھٹی میٹھی یادیں) شامل ہیں' جسے اردو ادب کا نادر' انوکھا اور منفرد تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

(اقتباس از تبصرہ' مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت' لاہور

' سنڈے میگزین' مورخہ ۲۱؍اگست ۲۰۰۵ء)

حیدر قریشی کا تعارف راقم السطور سے معروف ادیب وشاعر وصحافی نذیر فتح پوری اور انٹرنیٹ کی دین ہے۔اردو دوست ڈاٹ کام' حیدر قریشی ڈاٹ کام' حیدر قریشی اسپیس ڈاٹ لائیو ڈاٹ کام' جدید ادب ڈاٹ کام' جیسی ویب سائٹس نے یہ احساس دلایا کہ خانپور (پاکستان) کی سرزمیں سے ابھرنے والا قلمکار، جرمنی میں سکونت اختیار کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کو نئی بلندیاں فراہم کرنے اور دنیا بھر میں اردو کی پہچان انٹرنیٹ سے کروانے میں دائمی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔اس کارِ خیر کے علاوہ حیدر قریشی کی تحقیقی وتخلیقی تصانیف نے انہیں شہرت وعظمت کی نئی بلندیاں عطا کیں۔

راقم السطور ادب کی دنیا کا نوآموز طالبِ علم ہے' اور حیدر قریشی صاحب کا قد ادب میں بہت اونچا ہے لیکن' مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں ہے کہ حیدر صاحب نے راقم سے جو رابطہ روا رکھا ہے' وہ محبانہ اور دوستانہ ہے۔ادبی رسالہ اسباق' پونہ کے مدیر نذیر فتح پوری نے استاذی ڈاکٹر راہی قریشی اور راقم السطور پر ایک گوشہ نکالنے کا اعلان کیا تو ناچیز کی حقیر خدمتِ زبان کے پیشِ نظر حیدر صاحب نے ایک خوبصورت تحریر ارسال کی' جو' ان کی سادہ لوحی اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا بیّن ثبوت ہے۔

حیدر صاحب کی شعری ونثری کلیات، بلا شبہ چمنستان ادب کا عطر بیز، مرقع ءحسن ہے، جس کے مطالعہ سے نہ صرف نزدیک و دور کے بے شمار اہالِ اردو کے قلب و ذہن معطر ہو تے ہیں بلکہ زندگی کے بہت سے اسرار و رموز بھی ان پر کھلتے ہیں۔جس طرح ہر زبان کے ادب کی ابتداء شعر سے ہوئی ہے، اسی طرح حیدر صاحب اپنی کلیات میں بطورِ شاعر پہلے متعا رف ہو تے ہیں ۔شاعری کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ خود حسین ہو تی ہے اور حسن کو Repersent کرتی ہے۔حیدر صاحب کی سیرت و شخصیت میں حسن و عشق کے دو عظیم پہلو مو جود ہیں، اس لیے وہ ایک اچھے شاعر کے منصبِ عظیم سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں ۔مذکورہ بالا کلیات کے شعری مشمولات میں غزل، نظم، ماہیا، اور دو پدوں کے مطالعے سے قاری اس کنفیو ژن کا شکار ہو جا تا ہے کہ حیدر صاحب کو غزل کہنے میں مہارت ہے یا کہ نظم وماہیا کی تخلیق پر! کیونکہ، شاعری جن لوازماتِ فن کا استعمال اور صرفِ خونِ جگر کا تقاضہ کرتی ہے، حیدر صاحب منجملہ ءاوصافِ شاعری اس پر پورے اترتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری رو مان و حقیقتی" تفسیرِ غم "بن جاتی ہے۔جہاں غمِ جاناں و غمِ دوراں کا آفاقی اظہار بھی ہے اور محبوب کے حسن و جمال کا ایک میلہ بھی! خصوصاً غزل اور کے باب میں حیدر صاحب کی افکار کی تابانی، تجربے کی شدّت، فکر کی رسائی، مشاہدے کی گہرائی، احساسات کی کشادگی اور شیریں بیانی کی ایک دنیا قائل ہو چکی ہے، جو، شعر و ادب میں ان کا نام باقی رکھنے کے لیے کا فی ہے۔حیدر صاحب کی غزلوں کا سرسری مطالعہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ خدا نے انہیں چشمِ بصیرت عطا کی ہے۔جس کا اندازہ ذیل کے سہل و خوبصورت اشعار اور رواں دواں زباں سے ہوتا ہے۔

غم تمہارا نہیں جاناں، ہمیں دکھ اپنا ہے
تم بچھڑتے ہو تو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں

مرجھا چکے ہیں پھول تری یاد کے مگر
محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

دل کو تو بہت پہلے سے دھڑکا سا لگا تھا
پا نا ترا شا ید تجھے کھو نے کے لیے ہے
پھر اس کے وصل میں کیا جانے کتنی لذت ہو گی
وہ جس کا ہجر بھی لطفِ وصال رکھتا ہے
چند لمحے وہ ان سے ملا قات کے
مری سا نسوں میں بر سوں مہکتے رہے
نہیں ہے کو ئی بھی امید ' جس کے آنے کی
دل اس کے آنے کے سو سو قیاس رکھتا ہے
کردیا ہے اس نے کن خوش فہمیوں میں مبتلا
اس کے خالی خط کے معنی ڈھونڈتا رہتا ہوں میں
وہ چاند ' وہ گلاب 'وہ پتھر ' و ہ آگ بھی
جیسی مثال دیجیے 'بر حق مثال ہے
نہ پو را سوچ سکوں 'چھو سکوں ' نہ پڑھ پا ؤں
کبھی وہ چاند ' کبھی گل ' کبھی کتاب لگے
اس کی چیخوں کی صدا آج بھی آتی ہے مجھے
میں نے زندہ ہی تری یاد کو دفنا یا تھا
مرے ہی خواب گنوا رے نہیں رہے اب تو
کہ آرزوئیں تری بھی بیا ہیاں نہ گئیں
وہ پتھر دل سہی لیکن' ہما را بھی یہ دعویٰ ہے
ہما رے لب جنہیں چھو لیں' وہ پتھر بول اٹھتے ہیں
شرطوں پہ محبت کی کو ئی بات نہ کرنا
یہ تیرا طلب گار شہنشاہ نہیں ہے
صرف یہ عمرِ گریزاں ہی نہیں کرتی اداس

مرا ہنستا ہوا بچپن بھی رلا تا ہے مجھے

حیدرقریشی کی ماہیہ نگاری بھی غم ونشاط کی مخصوص کیفیت کا برملا اظہار اورتاثر کا دوسرا نام ہے' یہاں بھی ان کی زباں صاف' رواں دواں اور سیدھی سادھی ہے۔غزلوں کی طرح ماہیوں میں بھی ایہام کہیں نہیں ہے اور پونے تین مصرعوں کے ماہیوں میں بھی موسیقیت کا عنصر صاف نظرآتا ہے۔صنفِ ماہیا نگاری پرحیدرصاحب نے اردو میں ماہیا نگاری اردوماہیے کی تحریک'اوراردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما' جیسی تصانیف سپرد قلم کر کے پوری اردو دنیا سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے اور اپنی کلیات میں (۲۹۲) ماہیے ندرتِ تخیل' بصیرت افروزمشاہدہ اورتفحصِ الفاظ کے سہارے ماورائے ذہن ہوکرتخلیق کیے ہیں' جو جینے کا سلیقہ اورمرنے کا ادب سکھاتے ہیں' چاہنے اور چاہے جانے کا درس دیتے ہیں۔ان ماہیوں کے ذریعے حیدرصاحب نے اپنے پڑھنے والوں کوعشق وآگہی کی دولت عطا کرتے ہوئے ان کےقلب وذہن کے مصفّیٰ ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

رخصت کی گھڑی آئی
دل ماں کا دھڑکا
آنکھوں میں جھڑی آئی

ناکامی سے ڈرتے ہو
عشق بھی کرتے ہو
بدنامی سے ڈرتے ہو

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

کچھ من کی خرابی تھی
کچھ اس چہرے کی
رنگت بھی گلابی تھی

جنموں کی اداسی ہے
جسم ہے آسودہ
پرروح تو پیاسی ہے

نیت تھی مری کھوٹی
تم بھی تھے آمادہ
اورکھلتی گئی چوٹی

نہیں، ہم نہیں روئے تھے	تو کس کا سوالی تھا
چاند کی کرنوں میں	دامن دل جس کا
کچھ موتی پروئے تھے	خود اپنا ہی خالی تھا

کہا جاتا ہے صحبت کے اثر سے آدمی کیا درو دیوار بدل جاتے ہیں۔حیدر صاحب نے بھی نابغہء روزگار ڈاکٹر وزیر آغا (پاکستان) کی علمی صحبتوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔وہ اپنی تصنیف' ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت' میں رقمطراز ہیں کہ

''الٰہیاتی مسائل' روح کی حقیقت' انسان کی مخفی قوتیں اور کائنات کی بے پناہ وسعتیں' ان موضوعات پر ان سے کھل کر باتیں کی ہیں۔بعض ایسی باتیں جو اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا ہے' وزیر آغا سے بے خوف ہو کر کی ہیں اور ان کی گفتگو سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔''

(وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت۔ص۴۔نایاب پبلی کیشنز' خان پور۱۹۹۵ء)

حیدر صاحب کی زمین و زماں کی معلومات ہی نثر و نظم میں ڈھل کر کلیات بن گئی ہیں۔جس میں حیدر صاحب کی (۳۰) نظمیں' بہر حال اپنے حسن کا جادو جگاتی ہیں۔موجودہ زمانے میں نظم کی کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے۔کوئی بھی خیال تسلسل اور واقعہ کے ساتھ پیش کیا جائے تو وہ نظم ہے۔حیدر صاحب کی نظموں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے اور ان کی نظموں کو ان کے ذہنی اور سوانحی حالات کی روشنی میں بآسانی سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔پھاگن کی سفاک ہوا' ایبٹ آباد' دعا گزیدہ' میں پھر آنسوؤں کا گلہ گھونٹ دوں گا' مبارک باد اور پرسہ جیسی نظموں سے حیدر صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب بن جاتی ہے جس کی ہر سطر سے سادگی' فکر کی رسائی اور عزم کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے۔حیدر صاحب کی نظم نگاری پر ڈاکٹر سعادت سعید' شعبہء اردو۔انقرا یونیورسٹی' ترکی' کی رائے ملاحظہ کیجیے۔

حیدر قریشی اس امر سے آگاہ ہیں کہ صنفِ نظم میں ذاتی اور اجتماعی کیفیات متنوع پیرا یوں میں اجاگر ہو سکتی ہیں۔اس میں جذبے' تخیل اور فکر کی ترکیبی وحدت کی بنیاد پر' پرقوت اظہار کے دریچے وا ہوتے ہیں۔حیدر قریشی صنفِ نظم کی مطلوبہ و ملزمہ کلّی وحدت کا اہتمام

اس طور سے کرتے ہیں کہ اس کے اجزاء کا حسن اور تاثر برقرار رہتا ہے۔

(پیش لفظ۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات۔پروفیسر نذر خلیق۔

مطبوعہ میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔۲۰۰۳ء)

حیدر صاحب اپنی نظموں میں غمِ عشق سے زیادہ غمِ دنیا کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یعنی عشق بلائے جان ہے۔مگر اس کی جان (دنیا) اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش وایماں ہے۔ذیل میں حیدر صاحب کی دو نظموں کے دو مختصر حصے بطورِ نمونہ پیش ہیں۔

ذرا پھر دل کے دریا میں اتر کر
اپنی نم آنکھوں سے تھوڑا مسکراؤ
اور پھر سوچو!
زمیں، پانی، فضاؤں تک
جہاں بھی زندگی ہے
اس ہوا کی حکمرانی ہے
ہوا نہ ہوا گر تو زندگی معدوم ہو جائے
ہوا ناگن سہی، ڈائن سہی، لیکن
ہوا تو زندگی بھی ہے!! (**نظم: ہوا**)

☆☆☆☆

ڈرتا ہوں تیرے قُرب سے پتھرا نہ جاؤں میں
میں چاہتا ہوں صرف تجھے سوچتا رہوں
جب جانتا ہوں دل ترا ہے پتھروں کا ڈھیر
پھر آئینۂ روح کیوں ٹکراؤں گا بھلا؟
تسخیر کر کے میں تجھے کیا پاؤں گا بھلا؟
اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی دیکھتا رہوں

اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی سوچتا رہوں!

(نظم چاند کی تسخیر کے بعد)

حیدر صاحب کے دو افسانوی مجموعے بھی شاملِ کلیات ہیں۔ بیشتر افسانے غم کے ساتھ خوشی اور خوشی میں غم کی کیفیات پیش کرتے ہیں ۔ویسے بھی حیدر صاحب کی شاعری ہو کہ افسانہ نگاری' انشائیے ہوں کہ خاکہ نگاری' سفر نامے ہوں کہ کالم نگاری' سبھی ایک خاص ذہن کی پیداوار محسوس ہوتے ہیں۔ حیدر صاحب کی تحریر کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہنسنے میں رونے کو' چلنے میں ٹھہرنے کو' خاموشی میں آواز کو اور زندگی میں موت کو دھونڈتے ہیں اور ان کی تحریر کا سکوت بھی صدائے بازگشت بن جاتا ہے۔حیدر صاحب نے زیرِ عنوان روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں' جملہ (۲۵) افسانے تحریر کیے ہیں' جس میں چند ایک کے علاوہ سبھی افسانے ہماری توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہیں اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان افسانوں کا مطالعہ کلاسکیت اور جدیدیت کا منفرد طرزِ اظہار ہے۔

ادب کی ایک اہم صنف خاکہ نگاری بھی ہے ۔اردو میں یہ صنف اپنے لکھنے والوں کی جگر کاوی و جگر سوزی سے بے اعتنائی کے لیے گلہ گزار ہے۔ خاکہ نگاری طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار کی ظرافت و فراست کا مطالبہ کرتی ہے۔ حیدر صاحب کی فطرت میں حسِ مزاح موجود ہے' جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں مزاح ایک تبسمِ زیرِ لب کا سامان فراہم کرتا ہے۔اس صنف کے بارے میں وہ خود یہ کہتے ہیں کہ:

''خاکہ نگاری نہ تو شخصیت کی خاک اڑانے کا نام ہے اور نہ شخصیت پر خاک ڈالنے کا نام ہے' بلکہ یہ تو پلِ صراط پر سے گزرنے کا عمل ہے' جبکہ ادیب نما صحافیوں کے خاکے سرکس کے رسّوں پر چلنے کا منظر دکھاتے ہیں۔''

(بلند قامت ادیب' اکبر حمیدی۔ میری محبتیں' ص ۱۴۸۔
عمر لا حاصل کا حاصل ۔۲۰۰۵ء)

حیدر صاحب کی کلیات مذکورہ میں زیرِ عنوان میری محبتیں' (۲۰) خاکے ملتے ہیں' جس میں (۱۰) خاکے' اول خویش کی ذیلی سرخی کے ساتھ خون کے رشتوں والے ممدوحین پر

اور (۱۰) خاکے بعدِ درویش کے عنوان سے علمی و ادبی شخصیتوں پر پیش ہوئے ہیں۔سبھی خا کے زندگی کی حرارت اور زمانے کی نیرنگی کے ساتھ ساتھ حیدر صاحب کے افکار وفن اور نازک خیالی کا اظہار ہیں۔بعض مقامات پر موصوف کی تحریر اسقدر کربناک ہو جاتی ہے کہ ان کے آنسوؤں کی نمی ہمیں اپنی آنکھوں میں محسوس ہونے لگتی ہے اور سادہ واقعات بھی اسلوبِ بیان کے باعث حقیقت نگاری کی شان حاصل کر لیتے ہیں۔

حیدر صاحب نے بعنوان کھٹی میٹھی یادیں' تصنیف کے ذریعے ایک نئی صنف "یادنگا ری" کی اردو میں بنا ڈالی ہے۔جس میں (۱۳) مضامین موجود ہیں' جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ادب مسرت زائی کا سرچشمہ ہے۔ان مضامین میں واقعات کی پیش کشی اور اسلوبِ نگارش کی شان پوشیدہ ہے' جس سے حیدر صاحب کے دل کی مخفی دھڑکنوں کا اظہار ہوتا ہے۔

حیدر صاحب کی ایک انشائیہ تصنیف زیرِ عنوان'' فاصلے' قربتیں'' بھی مذکورہ کلیات میں شامل ہے۔جس میں جملہ دس انشائیے بیان ہوئے ہیں۔ جو لوگ سوچنے' سمجھنے کا سلیقہ اور مناسب ومتوازن رائے قائم کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں' وہ کسی بھی معاملے کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچتے ہیں۔انسان جس طرح مناظر فطرت اور چاند ستاروں سے متاثر ہوتا ہے' اسی طرح وہ اپنی گردو پیش کے اشیاء ومظاہر بھی متاثر ہوتا ہے۔انہی اشیاء ومظاہر کا حسین اظہار حیدر صاحب کے انشائیے ہیں۔

سفرِ حج اور سات عمرے کی یاوری بھی حیدر صاحب کا قابلِ رشک نصیب ہے۔زیر عنوان''سوئے حجاز'' حیدر صاحب کی مکہ مکرمہ اور مدینہ شریف کے زیارتوں کا سفر نامہ تصنیف کیا ہے۔یہ تصنیف موصوف کے شعری و نثری کلیات کا آخری حصہ ہے۔جس میں حیدر صا حب نے مقاماتِ سفرِ حج اور سات عمروں کی ادائیگی کے تاثرات' طور طریقے' فرائض و سنن کو کائنات اور اپنی ذات کے تناظر میں دیکھا' محسوس کیا اور پیش کیا ہے اور یہ ایک ایسا وصف ہے' جو ارفع و اعلیٰ احساسات کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔مذکورہ کلیات میں کعبہ شریف سے متعلق چند ماہیے' اور نعتِ شریف بھی قابلِ ذکر ہیں۔

ماریشس میں عالمی اردو کانفرنس اور پروفیسر نذر خلیق کا حیدر قریشی سے مکالمہ بھی

کلیاتِ بالا کی مشمولات ہیں ۔حیدر صاحب کی نثری وشعری کلیات یہ بتاتی ہے کہ اگر" عمر لا حاصل کا حاصل "چاہتے ہوتو اردو شعروادب کو اپنی زندگی کا ماحصل بنا لو۔کیونکہ'اردو شعرو ادب صرف شعروادب نہیں ہے بلکہ' آبِ حیات ہے' جس کو پی لینے سے قوم مرنہیں سکتی ۔یہ ایک حقیقت ہے کہ حیدر صاحب نے نظم ونثرِ اردو کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ۔جرمنی کے ماحول میں ان کا مسلسل مصروفِ شعروادب رہنا موجبِ صد تحسین ہے اوران کی عمر لا حاصل کا پیمانہ فکر ونظر کی دولت سے بھرا ہوا تہذیبی ورثہ ہے۔

(بحوالہ **عکاس** انٹرنیشنل ۔اسلام آباد۔جنوری ۲۰۱۰ء۔**مدیر ارشد خالد**)

حیدرقریشی کے نام

ایوب خاور(لاہور)

یہ 82-1981ء کی بات ہے جب میں کراچی سے لاہور ٹرانسفر ہوا۔ لاہور پیروں اور ولیوں کا شہر تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ادیبوں اور شاعروں اورفن کاروں کا شہر بھی ہے ۔ بڑے سے بڑے ادیب، شاعر، پینٹر، صحافی، پروفیسر، نقاد، موسیقار، مجسمہ ساز، گیت کار، گلوکار، فلم ساز، ہدایت کار، اداکار، سیکڑوں نام ہیں جن کی خوشبو لاہور کے گلی کوچوں میں آج بھی مہک رہی ہے۔ جب میں لاہور آیا تو میں بہت مسحور تھا، ٹی ہاؤس ،گورنمنٹ کالج ،اورینٹل کالج، نیشنل کالج آف دی آرٹس، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور ٹیلی وژن سینٹر یہ وہ جگہیں تھیں جہاں ایسی ہی نابغہ ہائے روزگار شخصیات سے ملاقات کے نتیجے میں مجھے ایک ادبی ماہ نامے کا خیال آیا اور اپنے جنرل منیجر کو بصری ادبی جریدے کا آئیڈیا پیش کردیا۔

اس ادبی ماہ نامے میں مختلف فنون کے تخلیق کار تو ہوتے ہی تھے لیکن وہ نوجوان تخلیق کار جو اُس وقت اپنے سینئرز کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے، اُنھیں بھی میں اس پروگرام کے ذریعے میں ٹیلی وژن دیکھنے والوں سے متعارف کروا رہا تھا۔ چناں چہ کئی نوجوان شعرا کے ساتھ ساتھ حیدرقریشی سے میری ملاقات اس ادبی ماہ نامے ہی کے پلیٹ فارم پر ہوئی۔ حیدرقریشی سے میرا تعارف دراصل محترم ومکرم ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے موقر جریدے ''اوراق'' کے صفحات میں چھپنے والی اس کی غزلوں اور نظموں نے کروایا تھا اور میں نے اُسے خان پور سے بلالیا...... حیدرقریشی کی شخصیت نے میرا دل موہ لیا۔ سو ٹیلی وژن پر ایک نئے شاعر اور ایک نئے پروڈیوسر ڈائریکٹر کا یہ عارضی رشتہ پرخلوص دوستی میں ایسے ڈھلا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ حیدرقریشی کا 'جدید اَدب' اِسی دہائی کی زندہ نشانی ہے جسے حیدر نے خان پور کی آب وہَوا میں جیسے تیسے زندہ رکھا اور پھر وہ کب جرمنی چلا

گیا مجھے معلوم نہ ہو پایا۔

ابھی ایک سال پہلے حیدر کے ٹیلی فون نے مجھے چونکا دیا۔ آواز میں وہی تازگی، پہچان، دوستانہ اور تعلقِ خاطر...... حیدر نے اپنا نام لیا تو میں ششدر رہ گیا۔اور ہمارے بیچ میں سے ستائیس اٹھائیس سال چپکے سے سرک کر ایک طرف کو ہو گئے۔ میں سمجھا کہ حیدر خان پور ہی سے بول رہا ہے اور جدید اَدب کے لیے کسی تازہ نظم کی فرمایش کرنے والا ہے......مگر وہ تو جرمنی سے فون کر رہا تھا مجھے...... وہی ستائیس اٹھائیس سال جو ہمارے بیچ میں سے روئی کے گالے کی طرح اُڑ کر ایک طرف کو ہو گئے تھے، چند منٹ میں 13 انچ موٹے شیشے کی دیوار کی طرح دھڑام سے ہمارے درمیان دوبارہ کھڑے ہو گئے ،فاصلے کا احساس بھی کتنا خوف ناک ہوتا ہے۔

حیدر اور اس کا 'جدید اَدب' ذہن سے محو تو ہرگز نہ ہوا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن کا ایک مصروف ترین اور مقبول ترین پروڈیوسر ڈائریکٹر بننے کے لیے جس طرح میں نے زندگی کے شب و روز کو اتھل پتھل کیا۔ اُس اتھل پتھل کے گرد وغبار نے شیشے کی اُس دیوار کو جس کے آر پار ہم بہت آسانی سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ اتنا میلا ضرور کر دیا تھا کہ حیدر کے ساتھ ساتھ اسکول ،کالج،یونی ورسٹی کے کچھ اور دوست بھی تھے جن کے چہرے دھندلے ہو گئے تھے۔زندگی ہے ہی کچھ ایسی کمینی چیز کہ انسان کو اپنے گھیرے میں یوں جکڑ لیتی ہے کہ سانس کا ردھم بھی بعض اوقات ٹوٹنے لگتا ہے اور اب تو زندگی خود ایک ناگہانی کے گھیرے میں ہے۔ بہت ڈر گئی ہے، سہم گئی ہے۔خودکش حملہ آوروں، دہشت گردوں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کے محاصرے میں اس ڈری ہوئی زندگی کو اوڑھے ہوئے لوگوں کے کانوں میں اگر کوئی شناسا آواز پڑ جائے تو غنیمت ہے۔لیکن حیدر کی آواز غنیمت نہیں بیش قیمت تھی۔ وہی خان پوریہ سا لہجہ...... وہی خلوص، وہی شعر و ادب کا چسکا، وہی 'جدید ادب'۔

'جدید اَدب' جو خان پور سے ایک چھوٹے سے چھاپہ خانے کی سیاہی سے روشن ہوتا تھا اب انٹرنیشنل ہو چکا ہے...... جن بڑی شخصیات سے بات کرنے کا ہم خواب دیکھتے تھے وہ

ادبی شخصیات اس جدید اَدب میں اپنی تخلیقات کے ساتھ جلوہ انداز ہوتے ہیں۔ حیدر کا رابطہ دنیا بھر کے اردو دان طبقے سے استوار ہے اور وہ خود نہ صرف یہ کہ غزل گو اور نظم گو ہے بلکہ افسانہ نگار ہے، انشائیہ نگار ہے۔گمبھیر ادبی معاملات پر ایک ثقہ قسم کے نقاد کی طرح اس کی گہری نظر ہے، یادداشتیں، سوانحی خاکے، اپنی زندگی، اپنے پورے خاندان کے افراد کے ساتھ اپنے میل جول اور رشتوں کی تفسیرات ،سفرنامے، حج بیت اللہ کی روداد، اپنے ذاتی روز و شب، اپنے قریب ترین شے یعنی بیوی بچوں کے بارے میں اپنے قاری کو اتنا کچھ اتنی آسانی سے بتا چکا ہے جیسے کھانے کی میز پر بیٹھے اپنے ذاتی دوستوں کو اپنے گھر کے درودیوار میں لگی ایک ایک اینٹ کے بارے میں بتا رہا ہو۔اس کی سینتیس سالہ ادبی زندگی گیارہ مختلف النوع تخلیقی کتابوں میں سجی ہوئی ہے۔اُس نے بہت اہتمام سے زندگی کو، زندگی کے معاملات کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو، رشتے ناتوں کو، کہانی ،شعر،نظم اور تنقید کو آپ بیتی اور جگ بیتی کو ہمارے ادبی منظر نامے کا حصہ بنایا ہے۔

قریباً ایک سال پہلے حیدرقریشی سے میرا رابطہ بحال ہوا۔ تب سے میری حیرانیوں کو سانس لینے کا موقع نہیں ملا۔ ایک تو اُس نے مجھے چھپنے چھپانے کے معاملے میں بہت Active کردیا ہے...... Active تو میں پہلے بھی تھا لیکن اپنے آپ میں گم ،ڈراما،میوزک، ادب، سب کو نئے رخ سے دیکھنے کی لگن اور دونمبر منافقینِ ادب سے کوسوں دور اپنی کٹیا تک محدود رہنا میرا شیوہ تھا۔ اس شخص نے میرے دل وجان میں بجلی بھر دی ۔ یہ شخص جب تک دو نمبر کو دونمبر ثابت نہ کردے چین کا سانس نہیں لیتا، یقین نہ آئے تو اپنے وقت کی معروف ترین شخصیت نارنگ صاحب سے پوچھیے ۔دوسری طرف ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ حیدر نے تب تک اپنے حلق سے نوالہ نہیں اتارا جب تک کسی جینوین ادیب یا شاعر کو اس کے حصّے کی داد نہ پہنچا دی۔ اور ان کاموں کو اس نے اپنا بہت سارا وقت دیا ہے۔سوچتا ہوں اگر حیدر جرمنی نہ گیا ہوتا تو اتنے ڈھیر سارے کام کیسے کرلیتا......اس کی تحریریں پڑھتے ہوئے بار بار میرے اندر یہ سوال اٹھا کہ میں حیدر کو ادب کے کس خانے میں فِٹ کروں مگر شاعری میں، افسانہ نگاری میں،خاکہ نگاری ،انشائیہ، تنقید ،سبھی خانوں میں یہ فٹ ہے اور قابلِ تحسین

ہے۔تحقیق کے میدان کو بھی نہ چھوڑا اور اپنی سرزمین کی مٹی سے، اس کی آب و ہوا سے، اُس کے روز وشب سے، اس کی گرمیوں ،سردیوں، کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو سے صورت پذیر ہونے والی ایک شعری صنف 'ماہیا'' کی ہیئت، اس کے اوزان اور اس کے موضوعات کے حوالے سے ہندوستان اور پاکستان ہی کے نہیں یورپ وامریکا تک کے ادبی حلقوں کو بھی سرگرم کر دیا۔ اب حیدرقریشی کا نام''ماہیا'' لکھنے اور پڑھنے والوں میں اتنا ہی مقبول ہے جتنا خود حیدرقریشی۔ بلکہ جدید ادب کے ہر شمارے کے ٹائٹل پیج پر اس کا کوئی 'ماہیا' ضرور درج ہوتا ہے۔

حیدر کی کلیات''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کو پڑھتے ہوئے مجھ پر کھلا کہ میری زندگی کا ابتدائی زمانہ اور حیدرقریشی کی زندگی کا ابتدائی زمانہ کس حد تک ایک دوسرے سے مشابہہ ہے۔حیدر نے مختلف جگہوں پر اپنی زندگی کے ابتدائی دور کی تفصیل بیان کی ہے۔ میں نے بھی بارہا اپنے انٹرویوز میں بلکہ اپنی پہلی کتاب گلِ موسمِ خزاں کے Preface میں بھی لکھا ہے کہ میں پرائمری اسکول میں پڑھتے وقت ہر اتوار کو چکوال شہر میں مزدوری کیا کرتا تھا۔میں نے اپنے ٹیچرز کے بچوں کو پڑھا کر اپنے اسکول کی فیس ادا کی ہے۔ میٹرک کے بعد میں نے بھی پرائمری اسکول میں مبلغ ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ کی بنیاد پر ملازمت کی ہے۔حیدر کی ابتدائی زندگی بھی مزدوری کرنے میں گزری ،فرق یہ کہ حیدر ایک فیکٹری میں مزدوری کیا کرتا تھا اور میں اپنے گاؤں کے پروفیشنل مزدوروں کے ساتھ اینٹ گارا ڈھویا کرتا تھا۔ٹیچنگ اِس نے بھی کی، میں نے بھی کی۔ ابتدائی زندگی کی اس مماثلت نے بھی ہمارے درمیان دوستی کا یہ گل زار کھلائے رکھا ہے۔اور یہ جو بہت طویل عرصے تک ہم ایک دوسرے سے نہ مل پائے تو یوں سمجھیے کہ زندگی کی تیز دھوپ سے بچنے کے لیے ہم نے اپنی اپنی دوستی کے اس گل زار کو اُن سبز چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا جو عموماً گھریلو پودوں کو مرجھانے سے بچانے کے کام آتی ہیں اور ہم خود اپنی اپنی جگہ ایک نئی زمین کی گوڈی کرنے اور اس پر اپنی اپنی زندگی کا ایک نیا باغ تعمیر کرنے میں لگے رہے۔اب جو اس دوستی کے گل زار پر سے وقت کی یہ سبز چادر ہٹی تو دیکھا کہ سارے کے سارے گملوں میں، سارے کے سارے پھول ویسے کے ویسے ہی تازہ ہیں۔

حیدرقریشی کل بھی راضی بہ رضائے الٰہی تھا اور آج بھی۔ اس کے بہت سارے دوست ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ حیدر نے کچھ عرصہ پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ اس کی موت واقع ہونے والی ہے۔ اس نے ہماری بھابی مبارکہ کو، بچوں کو اور سبھی دوستوں کو نہ صرف بتایا بلکہ اس خواب کے مطابق اپنی زندگی کے بہت سے معاملات کو عملی طور پر سمیٹنا بھی شروع کر دیا۔ اس عمل میں حیدر کی طرف سے خواب پرستی کا اشارہ کہیں نہیں ہے۔ حیدر کی یاداشتوں کا تازہ Chapter ثابت کرتا ہے کہ زندگی کی بے ثباتی اور موت کے برحق ہونے پر حیدر کا یقینِ کامل کس درجے کا ہے۔اس کی زندگی مسلسل محنت سے عبارت ہے اور اس خوف سے عاری ہے کہ نہ جانے کل کیا ہوگا۔ اسی درویشانہ سوچ کی برکت ہے کہ اس بے ثبات زندگی میں قدرت نے اس کو آلایشوں سے پاک اور بنیادی آسایشوں والی زندگی میں علم و اَدب کی خدمت اور دوستوں سے محبت کرنے کا موقع دے رکھا ہے۔ اللہ اِسے خوش رکھے۔

میں اس کی ساری کتابیں تفصیل سے تو ابھی نہیں پڑھ سکا لیکن سب کتابوں کو دیکھا ضرور ہے.....مثلاً اس کی جو کہانیاں میں اب تک پڑھ سکا ہوں اُن میں ''میں انتظار کرتا ہوں''ایک ایسی علامتی کہانی ہے جس میں ایک فردِ واحد کے ساتھ انسانی معاشرے کے عمومی رویّے کوانسانی تاریخ کے Perspective میں دیکھا گیا ہے۔

ماں باپ کی آپس کی Relationship اور بچے۔اس مجموعی تعلق کو ایک ایسی تکون میں دیکھا گیا ہے جس کے تینوں زاویے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اپنی شکلیں بدلتے رہتے ہیں جیسے تینوں لائینیں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جڑی ہیں بلکہ ایک دوسرے کا پرتو بھی ہیں۔

''کاکروچ'' حیدر کی ان کہانیوں میں سے ہے جو کہانی کے لیے نئے کرداروں کی تخلیق کی ایک ممکنہ جستجو ہے،اس کہانی کو پڑھ کر پتا چلا کہ اگر ایٹمی طاقتیں اس بیچاری دنیا کی انسانی آبادی کو قیامت سے پہلے ہی ختم کر دیں،کوئی انسان باقی نہ بچے تو مکھی کا ایک جوڑا یا کاکروچ کا جوڑا اس کرۂ ارض پر ایک نئی دنیا آباد کرے گا اگر ایسا ہوا تو قیامت کے دن کا کروچ...... حیدر کی کہانی کے آخر میں دو جملے پڑھ کر مزید یہ بھی کہنے کو جی چاہ رہا ہے کہ اگر کسی ابتدائی

زمانے میں انسان چوپایا ہوسکتا ہے تو کاکروچ اپنے ترقی یافتہ زمانے میں دوپایہ کیوں نہیں ہوسکتا۔

''انکل انیس'' اور''بابا جمال شاہ کا جلال'' بھی اپنی سادگی اور معنی خیزی کے حوالے سے بہت اچھی کہانیاں ہیں۔

حیدر نے بے شمار دوستوں اور رشتے داروں اور ادیبوں کے خاکے لکھے ہیں لیکن جن دوخاکوں نے مجھے صحیح معنوں میں اسیر کرلیا وہ'' برگد کا پیڑ'' اور''مائے نی میں کہنوں آکھاں'' دوایسے خاکے ہیں جن کا کوئی نہ کوئی پہلو ہر انسان کی زندگی میں موجود ہے۔

حیدر کے شعری مجموعوں میں جو نظمیں مجھے پسند آئیں اُن میں''درد''،''پھاگن کی سفاک ہوا''،''ایبٹ آباد''،''منی پلانٹ''،''ایک دراوڑ کا پیغام آریانوں کے نام''،''تیامت''،''چلو ایک نظم لکھتے ہیں'' اور بہت سے'ماہیے'......نظمیں ساری کی ساری تو یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔حیدر کی غزلوں کے کچھ اشعار آپ سے ضرور شیئر کروں گا۔

روشنی روشنی سی ہر سُو ہے
یہ تیرا دھیان ہے کہ خود تُو ہے

خود اپنے ہونٹوں پہ صدیوں کی پیاس رکھتا ہے
وہ ایک شخص جو مجھ کو اداس رکھتا ہے

دلوں کا خون کرنے لگ گئے ہو
بڑے سفاک ہوتے جارہے ہو

اُس نے آنا ہی نہیں تھا اس محلے کی طرف
ہم سجاتے ہی رہے بے سُود گھر کے راستے

ابرِ رحمت اب کے حیدر، بن گیا جیسے عذاب
کر دیے برسات نے مسدود گھر کے راستے

وہ بھی اپنے آئینے میں دیکھتا ہو گا مجھے
جس کو اپنے آئینے میں دیکھتا رہتا ہوں میں
دل کے دروازے پہ دستک دے کے چھپ جاتا ہے وہ
اور اپنے سامنے حیدؔر کھڑا رہتا ہوں میں

ہوا شہکار جب اس کا مکمل وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا
شبِ تنہائی میں اک شخص دل پر اُجالے کی طرح پھیلا ہوا تھا

میرے، اُس کے درمیاں جو فاصلہ رکھا گیا
اس کو طے کرنے کا بھی اک راستہ رکھا گیا
بھر کے آنکھوں میں سلگتے خواب اس کی یاد کے
مجھ کو سوتے میں بھی حیدؔر جاگتا رکھا گیا

وہ موم ہے اگر تو اُسے دھوپ سے بچا
پتھر ہے اس کا دل تو اُسے پاش پاش کر

اُس میں مل جائے گا جا کر میرے اندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد

کعبۂ دل کو کہاں چھوڑ چلے ہو حیدؔر
تم تو کہتے تھے یہ ہجرت نہیں ہونے والی

اے خدا ڈر ہے مجھے طے ہی نہ ہو جائے کہیں
منزلِ عشق کو دوچار قدم رہنے دے

نہیں تو صرف مرے حال سے نہیں واقف
وہ بے خبر جو جہاں بھر کے راز رکھتا ہے

جب اس نے خاک اڑانے کا ارادہ کرلیا ہے
تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کرلیا ہے

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی
زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی
آج اولاد کے آئینے میں حیدر ہم نے
تازہ کرلی ہے ہر اک یاد پرانی اپنی

اب کے اُس نے کمال کر ڈالا
اک خوشی سے نڈھال کر ڈالا
اک حقیقت کے روپ میں آ کر
مجھ کو خواب و خیال کر ڈالا
(ناتمام)

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۱۳۔
مارچ ۲۰۱۱ء۔**مدیر ارشد خالد**

☆☆☆

''عمرلا حاصل کا حاصل'' حیدرقریشی کی ادبی کائنات

نعیم الرحمن (کراچی)

حیدرقریشی ایک ہمہ جہت شاعروادیب ہیں۔شاعری میں نظم ،غزل اور اردو ماہیا اگر حیدرقریشی کی پہچان ہیں تو نثر میں افسانہ، انشائیہ، خاکے،تنقید،سفر نامہ اور کالم نگاری ہر طرز میں انہوں نے اپنی دھاک بٹھائی ہے۔حیدرقریشی کی شاعری روایت اور دھرتی سے جڑی ہے،انکی غزل میں پنجابی اورسرائیکی الفاظ کا استعمال انہیں ایک منفرد انداز دیتا ہے، پھر اردو ماہیے کے فروغ کیلئے تو انہوں نے بے پناہ کاوشیں کی ہیں۔شاعروادیب کے علاوہ جرمنی سے ''جدید ادب'' جیسا بے مثال ادبی جریدے کے ذریعے حیدرقریشی نے مدیر کے طور پر بھی نہ صرف اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے بلکہ اردو دنیا کے دوراورانتہائی کم وسائل میں پرچہ کو باقاعدگی سے شائع کر کے اردوادب سے اپنے لگاؤ کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔

1971 ء میں پہلی غزل کہنے والے اورخانپور میں ''حلقہ ارباب ذوق'' کے بانی حیدرقریشی کی پانچ شعری اور چھ نثری کتب کا مجموعہ ''عمرلا حاصل کا حاصل'' حال ہی میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔اس کلیات کی اشاعت کے ساتھ حیدرقریشی نے ایک بار پھر اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔شعری کلیات کی اشاعت کی روایت تو کافی پرانی ہے،گذشتہ چند دہائیوں میں نثری کلیات بھی بڑی تعداد میں سامنے آئی ہیں،جن کی ابتدااردو کے عظیم افسانہ نگاروں سعادت حسن منٹو، پریم چندوغیرہ کے ادبی سرمایے کو یکجا کرنے سے ہوئی پھر دورحاضر کے ادیبوں کی کلیات بھی شائع ہوئیں۔حیدرقریشی نے نظم،غزل اور ماہیے پر مشتمل اپنی چار کتابوں ''سلگتے خواب'' ''عمرگریزاں'' ''دعائے دل'' ''دردسمندر'' اور ماہیے کے مجموعے ''محبت کے پھول''،افسانوی مجموعوں ''روشنی کی بشارت'' ، ''قصے کہانیاں'' شخصی خاکوں اور یادوں کی کتابوں ''میری محبتیں'' اور ''کھٹی میٹھی یادیں'' انشائیوں کی کتاب ''فاصلے اورقربتیں'' اور سفرنامہ حج

''سوئے حجاز'' کوایک ہی جلد میں مجتمع کر دیا ہے اور اس طرح لا حاصل سے حاصل کرنے کا ہنر بھی حیدرقریشی ہی کے حصے میں آیا، اس مجموعے میں انہوں نے اپنی گیارہ کتابوں کے بعد کی تحریریں بھی شامل کردی ہیں۔یوں بڑے سائز کے 616 صفحات کی اس کلیات کے ذریعے حیدرقریشی کا اب تک کامکمل ادبی سفرقاری کے سامنے آ گیا ہے۔

اردوماہیے کے فروغ میں حیدرقریشی نے غیرمعمولی کردارادا کیا ہے اوران کے اپنے ماہیوں میں مٹی کی خوشبوالگ سے پہچانی جاتی ہے۔ان ماہیوں میں حمد،عشق رسولؐ،دھرتی سے محبت،رشتوں کی اہمیت،داستانیں،شادی بیاہ کی رسوم،ذاتی اور اجتماعی دکھ اورجرمنی میں بیتے برسوں کابیان، کیا کچھ نہیں ہے۔ اوران ماہیوں کے ہرلفظ میں ایک جیتا جاگتا حیدرقریشی دھڑکتامحسوس ہوتا ہے۔

حیدرقریشی کی غزل روایتی کلاسیکی غزل سے وابستہ ہے اور اس میں پنجابی اور سرائیکی لہجہ اسے ایک نیا آہنگ دیتامحسوس ہوتا ہے اور یہ غزل اردولفظیات میں کچھ دلکش اضافے بھی کرتی نظرآتی ہے۔انکی غزل میں عشق حقیقی اورعشق مجازی کے دوش بدوش غم دنیا اورغم روزگاراوردیگر مسائل بھی نمایاں ہیں۔انکی نظموں کے موضوعات''ایک اداس کہانی''،''درد''،''ایبٹ آباد''اور''حاصل زندگی''اپنے عنوانات ہی سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلیتے ہیں اوران میں عملی زندگی کی تصویریں نظرآتی ہیں۔حیدرقریشی کی شاعری میں قنوطیت کے بجائے امیدکا دیا جگمگاتا ہے۔ڈاکٹرکرسٹینااوسٹرہیلڈ کا کہنا ہے کہ حیدرقریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے ایک بار پڑھنا شروع کیا تو جی چاہاپڑھتی چلی جاؤں۔دوسرا وصف بے باکی اوروارفتگی کا ہے۔

حیدرقریشی کے افسانے انسانی جذبات ،احساسات سے بھرپور ہیں اوران میں ہمارے اردگرد کی زندگی اور جیتے جاگتے کرداربکھرے نظرآتے ہیں۔علامت کا استعمال وہ لایعنی انداز میں نہیں کرتے بلکہ بےمعنی تجرید کے بجائے علامت بیحد جاندار انداز میں سامنے آتی ہے۔دیوندراسر کے مطابق حیدرقریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے،سچائی کاالمیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔یہ کہانیاں کائناتی انسان،خدا،روح،ثقافت

اور ثقافتی وراثت کے ازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔
کھٹی میٹھی یادیں اور میری محبتیں کے خاکے دراصل حیدرقریشی کی عمرگذشتہ کا احوال ہے۔جس میں قریبی رشتہ داروں اوراحباب کا تزکرہ انتہائی جذبے اورخلوص سے کیا گیاہے اورکسی شخصیت کے بیان میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔سوئے حجاز حیدرقریشی کا سفرنامہ حج ہے جس میں سات عمرے اورایک حج کابیان کیاگیا ہے۔اس سفرنامے میں تصوف کارنگ،واردات قلبی اورروحانی تجربات کا ذکرقاری کوایک نئی دنیا میں پہنچادیتا ہے۔
عمرلاحاصل کا حاصل ایک ایسی کتاب ہے جس کا مطالعہ ہرادب دوست قاری کوکرنا چاہیئے اور میں حیدرقریشی کی اس خواہش کے پورے ہونے کی دعا کرتا ہوں کہ انہیں پاکستان میں بھی کوئی ایماندار پبلشرمل جائے تاکہ یہ کتاب پاکستان میں بھی شائع ہوسکے۔

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔شمارہ نمبر۱۳۔
مارچ ۲۰۱۱ء۔**مدیر ارشد خالد**

☆☆☆

برگد مثال حیدر قریشی

افضل چوہان (مظفر گڑھ)

یوں تو ہر درخت جڑ، تنا، پتے، چھال اور پھل وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔حیدر قریشی سے رابطہ ہونے کے بعد میں نے جب بھی برگد کے درخت کے بارے میں سوچا یا دیکھا تو مجھے حیدر قریشی کی شخصیت برگد کے ایک پیڑ کی مانند لگی۔حیدر قریشی کی ادبی قد آوری کی بات کی جائے تو برگد کا قد اس کا پھیلاؤ اور عاجزانہ جھکاؤ ان پر صد فی صد منطبق ہوتا ہے۔جب ان کی ادب پروری اور اپنے جونیئرز کے ساتھ پیار بھرے رویئے اور حوصلہ افزائی کی بات کی جائے تو اس کی چھاؤں حیدر قریشی کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔برگد کی چھاؤں کسی بھی اور درخت کی چھاؤں سے یوں بھی منفرد و ممتاز ہے کہ اس کی چھاؤں میں کوئی چھید تک محسوس نہیں ہوتا۔دھوپ کی حدت اس سے چھن کر بھی نیچے تک نہیں پہنچتی کہ پتے اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ دھوپ اپنی تمازت لئے اس کی چھتر چھاؤں کے اوپر ہی خیمہ زن رہتی ہے۔برگد کی جڑ لکڑی چھال پتے شاخیں ہی نہیں اس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا دودھ بھی انسان کے لئے مفید ہوتا ہے۔اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ برگد کا ایک ایک ذرہ حیات بخش اور تسکین آفریں ہے۔ہزار ہا بیماریوں کا شافی علاج رب تعالی نے برگد میں سمو دیا ہے حیدر قریشی نے کس کس صنف میں طبع آزمائی کی انہیں ہم استعارتی طور پر برگد کے حصوں سے جوڑ سکتے ہیں۔

بنظر غائر اگر ہم اردو ادب کے موجودہ دور کے مشاہیر پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ غزل گو شعراء نظم کے پیرائے میں اپنے اظہارِ خیال پر وہ گرفت کھو دیتے ہیں جو غزل کے اشعار میں ان کی انفرادیت اور خاصہ شمار کی جاتی ہے۔اسی طرح نظم گو شعراء غزل کے میدان میں وہ شہسواری نہیں دکھا پاتے جو ان کا طرہ امتیاز ہوتی ہے۔نتیجتاً وہ کسی ایک صنف تک محدود ہو جاتے ہیں۔

اگر تحقیق و تنقید کے میدان میں نظر دوڑائیں تو نقاد اور محقق صرف اسی صنف تک محدود

ہوکر رہ جاتے ہیں اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اچھے اچھے شعروں کی درگت بنا کر اور اچھے اچھے کلام کے بخیے ادھیڑ کر انہوں نے شہرت کی بلندیاں حاصل کی ہوتیں ہیں اب اگر صاحب اسلوب شاعر یا مصنف کہلانا چاہتے ہوں تو انہیں نہایت عرق ریزی سے وہ کچھ تخلیق کرنا پڑتا ہے جس پر کم سے کم قلم رکھا جاسکے اور کم سے کم تنقید کا نشانہ بنے یہی وجہ ہے کہ ایسے نقاد اور محقق آپ کو ہزاروں مل جائیں گے ۔جن کی تنقید و تحقیق پر بیسیوں کتابیں ہوں گی مگر اپنا کلام یا تخلیق ایک آدھ کتاب سے آگے نہ بڑھا ہوگا مگر ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو خود بھی بڑے تخلیق کار ہوں اور تنقید و تحقیق میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہوں ۔حیدر قریشی انہی چند گنے چنے ناموں میں سے ایک ہیں جنہوں نے 1971ء میں صرف اٹھارہ سال کی عمر سے جو ادب کی خدمت شروع کی تو آج تک پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ۔ ہر لحظہ ہر ساعت نئی منزلیں تراشیں اور آنے والوں کے لئے مثالیں قائم کیں ۔حیدر قریشی کو غیر تخلیقی رویوں نے ہی ہر دور میں چھلنی نہیں کیا بلکہ ادبی زکوٰۃ پر پلنے والوں غیر سنجیدہ تخلیق کاروں نے ان کی راہ میں مخالفت و دشمنی کی کی رُکاوٹیں کھڑی کر کے انہیں سفر جاری رکھنے سے حتیٰ الامکان روکنے کی کوشش کی ۔ مگر حیدر قریشی تو برگد تھا ۔ جسے ہر حال میں بڑھتے رہنا تھا ۔اور اپنا قد اونچا کر کے ہزاروں آنے والوں کے لئے چھاؤں مہیا کرنا تھی ، لہٰذا مخالفین کی کوششیں یکسر رائیگاں ہوتی گئیں اور خلوص نیتی کی ایک بار پھر جیت ہوگئی ۔حیدر قریشی نے اپنا سفر جاری رکھا کسی مخالف کی پرواہ کئے بغیر بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ دشمنوں کی دشمنی اور دوستوں کی دوستی کی پرواہ کیئے بغیر محوِ سفر رہے ۔دشمن تو مخالفت برائے مخالفت میں راہیں مسدود کرتے ہیں جبکہ دوست بے جا تعریف سے تخفیفِ سفر کا باعث بنتے ہیں ۔حیدر قریشی ہر دو سے بچتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے اور آج اس مقام پر ہیں کہ انہیں رات کا چاند اور دن کا سورج کہا جاسکتا ہے ۔ روشنی، نیکی اور محبت ہر دور میں موجود رہے ہیں ۔اور تا قیامت موجور رہیں گے ۔ ان کی مخالفت میں ایک زمانہ ساز باز کر لے مگر ان کے ادبی کام کو مٹا دینا کبھی کسی کے بس میں نہیں رہا ۔ روشنی کو اندھیرا کچھ وقت کے لئے اوجھل ضرور کرسکتا ہے مگر تادیر اس کی راہ روکنا کبھی تیرگی کے بس میں نہیں رہا ، یہی وجہ ہے کہ تیرگی کے لئے سمندر کو روشنی کی ایک کمزور کرن بھی

پاٹ سکتی ہے ۔ برائی نیکی کے سامنے ہر طور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور محبت نفرت کے مقابلے میں ناکام و نامراد ہو ایسا نہ آج تک ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہوگا ، ان کی طاقت ہمیشہ مسلّم رہی ہے ۔ یہ تینوں چیزیں ہمیشہ حیدر قریشی کے دائیں بائیں رہی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ حیدر قریشی کی ہر مخالف طاقت ، ہر دشمنی کو زیر کرنے میں روشنی ، نیکی ، اور محبت ہی ہتھیار ثابت ہوئے ہیں ۔ اور یہ تینوں ہتھیار جسے رب تعالےٰ کی طرف سے ودیعت ہوئے ہوں ۔ اس سا خوش نصیب تو پھر شاید ہی کوئی زمانے میں ہو ۔

حیدر قریشی کو جب ہم غزل کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو ان کے اشعار میں نیا پن نظر آتا ہے ان کی شاعری زندگی کے بہتر رویوں کی طرف اشارہ ہے حیدر قریشی بد سے بد تر حالات سے مایوس نہیں ہیں جو کے انسان نے خود پیدا کئے ہیں بلکہ وہ اس امید سے بندھے ہیں کہ انسان کو کبھی نہ کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جانے پر انسانیت کی معراج کی طرف لوٹ آنا ہے، اسی کو وہ یوں بیان کرتے ہیں

ابھی کچھ اور بھی الزام وہ لگائے گا
پھر اس کے بعد اسے آب آب ہونا ہے

حیدر قریشی اپنے کلام کی روشنی میں ایک صوفی بھی ہیں جو روحانی طاقت کے دل سے قائل ہیں اور رب کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے اور نیکی کی قوت کو ہر جگہ کارفرما دیکھتے ہیں ۔

لاکھ صحرا اور سمندر بچھ گئے تھے راہ میں
ان فقیروں کو جہاں سے پار ہونا تھا، ہوئے

ہر شاعر کی طرح حیدر قریشی بھی رومانیت پسند ہیں ، انسانوں ، چیزوں ، مناظر اور رویوں میں خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں ان کی یہ شاعری پر اثر بھی ہے اور خوبصورت بھی

جسم کا سحر، طلسم آنکھ کا، لب کے منتر
اس میں بھی کتنے فسوں ساز ہنر رہتے ہیں

تجھ کو خدائے حسن تو ہم مان ہی چکے
مت اس سے بڑھ کے حسن وجوانی پہ مان کر
واجب حضور حسن میں ہوتی ہے نذر بھی
اس بارگہ میں پیش تو دل کا جہان کر

اسی طرح حیدر قریشی کی شاعری میں جا بجا بوسیدہ نظام اور اس کے پروردہ آقاؤں کے خلاف ایک نفرت ایک احتجاج بھی ملے گا۔یوں حیدر قریشی نے بےخوفی سے جبر کے خلاف بھی آواز بلند کی ہےاور معاشرتی ناہمواریوں خوب اظہار خیال کیا ہے

خدا کے نام پہ تم نے بہت خدائی کی
تمہارے جبر کا اب احتساب ہونا ہے

ماہیا ایک لوک گیت ہے جسے اردو میں غیر ضروری طور پر متنازعہ ادبی صنف بنا دیا گیا۔ اس کو پہلے پہل کس نے تحریر کیا کی بحث چھڑی اور اس کے وزن کے سادہ سے مسئلہ کو تختۂ مشق بنایا گیا۔اور ان دو مباحث میں ماہیا کی خوبصورتی کو گہن لگنے کے ساتھ ساتھ اس پر جتنا کام ہونا تھا وہ بھی متاثر ہوا۔کوئی بھی تخلیق کار کبھی نہیں چاہتا کہ وہ نہایت عرق ریزی سے کوئی تخلیق منظر عام پر لائے مگر وہ اس کی نیک نامی اور شہرت میں اضافے کی بجائے محض ایک بحث کا موضوع بن کر رہ جائے۔ایسے حالات میں چند سر پھرے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ اپنا راستہ سنگلاخ چٹانیں تراش کر بناتے ہیں اور آسیبوں بھرے رستوں سے مردانہ وار ہر رکاوٹ کا مقابلہ کرتے ہوئے منزل پر پہنچنے کی خوشی ایک الگ ہی خوشی ہوتی ہے۔اور ہر دور میں زیادہ نہیں تو چند لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اس خوشی سے سرشار ہوکر منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔حیدر قریشی نے خود کو کبھی آسان راستے سے گزارنے کا گناہ نہیں کیا۔ ماہیا کا بانی کون ہے کی بحث ہو یا اس کے اوزان کا مسئلہ موضوعِ سخن ہو حیدر قریشی نے کسی سے پہلو تہی نہیں کی انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہر سوال کو سنا اور پھر برسوں کی محنت کے بعد اب تک ہونے والی تمام مباحث کو اپنی مدلّل تحاریر سے سمیٹ کر اب تک ہونے والی تمام

تحقیق کو مدِ نظر رکھ کر ایک مثبت ، قابل عمل اور قابل قبول حل پیش کر دیا ہے ، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ماہیا سے متعلق ہر چھوٹی بڑی دلیل، مضمون، جملے ، یہاں تک کہ ذاتی نوعیت کی خط وکتابت تک کو نظر انداز نہیں کیا اور نہایت محنت سے تمام کو کتابی شکل میں پیش کر کے اب تک دستیاب حقائق کی روشنی میں یہ دو مسئلے حل کر دیئے ہیں ۔ ماہیئے کی تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیق کی طرف بھی حیدر قریشی نے بہت توجہ دی اور ایک زود گو شاعر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بیش قیمت ماہیئے نہ صرف تخلیق کئے بلکہ شائع کر کے انہیں ماہیا سے محبت کرنے والوں تک پہنچایا ۔کسی کا حق پہچاننا اور لوگوں تک پہنچانا ایک بہت بڑا کام ہے جو حیدر قریشی کے مزاج کا حصہ بھی ہے حیدر قریشی نے یوں انجام دیا کہ ماہیا نگاری کی ابتدا کے سلسلے میں غلط فہمی کی بنیاد پر جو نام لئے جاتے تھے ۔ان میں قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی شامل تھے جبکہ ماہیا نگاری کے حقیقی بانی ہمت رائے شرما ہیں ۔ حیدر قریشی نے 1919ء میں ضلع سیالکوٹ کے مشہور قصبے نارووال میں پیدا ہونے والے ہمت رائے شرما کو مدلل اندازِ گفتگو سے ماہیئے کا بانی ثابت کیا ۔ یوں ایک طرف تو ماہیا کی ابتدا کے بارے میں ہونے والی متنازعہ گفتگو سمیٹ دی تو دوسری طرف ہمت رائے شرما کو ان کا جائز مقام دلوا دیا جو شاعری کے علاوہ بھی گوں نا گوں صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ ہمت رائے شرما کے ماہیئے 1936ء میں صرف سترہ سال کی عمر میں فلم ''خاموشی'' کی زینت بنے اس کے علاوہ وہ نغمہ نگار، کہانی کار، آرٹ ڈائریکٹر اور ڈائریکٹر تک کے ذمہ دارانہ فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے ۔

ماہیا کے ذیل میں حیدر قریشی نے ماہیا کے مزاج ، پنجابی لوک گیت ماہیا، ماہیا کے اوزان ،ماہیا کی ابتداء، اردو میں ماہیا نگاری، ماہیا اور چن ماہی ،اردو ماہیا کی تحریک ، ماہیا کی بحث ، ماہیا کے فروغ میں خواتین کا حصہ، ماہیا کا جواز ، ماہیا کے خدو خال ،تمام پر سیر حاصل بحث کی ہے اور کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا جو تشنہ رہا ہو ۔

☆☆☆

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد ۔شمارہ نمبر ۱۳۔

مارچ ۲۰۱۱ء ۔**مدیر ارشد خالد**

حیدر قریشی کی ماہیا نگاری

عارف فرہاد (راولپنڈی)

۱۹۹۲ء میں حیدر قریشی نے نہ صرف مختلف ادبی پرچوں اور مُوقّر ادبی جرائد کے ذریعے ماہیے کے وزن پر اربابِ دانش کی توجہ مرکوز کی بلکہ اردو ماہیے کے اصل اوزان کی نشاندہی بھی کی۔ رفتہ رفتہ ان کا یہ اصلاحی عمل ایک اہم تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور آج لگ بھگ ۱۰۰ اشعراء کرام درست اوزان میں ماہیے تخلیق کر رہے ہیں ۔ اردو ماہیے کے درست وزن کے مطابق دوسرے مصرعہ میں ایک سبب یعنی دو حروف کم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر۔

فعلن فعلن فعلن	مستی سے بھری پہلی
فعلن فعلن فع	اَلّھڑ مٹیاریں
فعلن فعلن فعلن	جب کھیل گئیں "کِکلی"

دوسری صورت میں۔

مفعول مفاعیلن	تختی کو سُکھاتے تھے
فعل مفاعیلن	خواب سُہانے تھے
مفعول مفاعیلن	پر دل کو دُکھاتے تھے

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں ماہیے کے دوسرے مصرع میں ایک "سبب" کم رکھا گیا ہے اور یہی ماہیے کا اصل وزن ہے۔ جب تک اردو ماہیا مذکورہ بالا وزن میں نہیں ہوگا اُسے ماہیے کی مخصوص دھن میں نہیں گایا جا سکتا۔ چونکہ بنیادی طور پر ماہیا ایک لوک گیت ہے اس لیے اس کی اصل پہچان اس کی مخصوص دھن ہے جو لوک گلوکاروں کے بعد معروف فلمی اور غیر فلمی گلوکاروں کی آواز میں محفوظ ہے۔ حیدر قریشی نے بھی ماہیے کو تخلیق کرتے وقت اس کے اصل اوزان کا باقاعدہ طور پر خیال رکھا ہے کہ اردو ماہیے کے اصل وزن کے مطابق ان کا اردو

ماہیوں پر مشتمل مجموعہ کلام "محبت کے پھول" سب سے پہلے ۱۹۹۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس میں ماہیے کے روایتی رنگ ڈھنگ کے ساتھ نئے موضوعات کے ذریعے انہوں نے ماہیے کے دامن میں وسعت پیدا کی ہے۔

پہلے پہل پنجابی ماہیوں میں صرف محبوب کے ہجر ووصال اور محبوب کے حسن کی باتیں ہی کی جاتی تھیں۔ لیکن جب یہ صنفِ سخن پنجابی سے اردو زبان میں آئی تو اس کے مزاج میں اور زیادہ رنگینی پیدا ہوئی اور اس کے موضوعات میں بھی اضافہ ہوا۔ حیدرقریشی نے اپنے ماہیوں میں محبوب کی جدائی کے دُکھ اور حسن کے مضامین کے علاوہ حمد، نعت، شادی بیاہ کے جذبات، وطن کی محبت اور دیگر کئی فکری مضامین کے ساتھ ساتھ پہلی بار رشتہ داریوں کا تذکرہ بھی عمدگی سے کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے مکالماتی اردو ماہیے بھی کہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان کے مکالماتی ماہیے انفرادی نوعیت کے لحاظ سے زیادہ اہم ہیں۔ حیدرقریشی کے چند حمدیہ ماہیے ملاحظہ فرمائیں۔

تُو خود میں اکیلا ہے	تو خالقِ اعلیٰ ہے
تیرے دم سے مگر	جو ہر نام سے اور
سنسار کا میلہ ہے	ہر روپ سے بالا ہے

اب ان کے کچھ دعائیہ ماہیے دیکھیں جن میں اُنہوں نے معاشرتی نفرت کے اندھیروں کی وجہ سے پیدا ہونے والی ظلمت کو ختم کرنے اور آپس میں محبت سے پُر فضا کے لیے دعا کی ہے۔

نفرت کے اندھیروں کو	دنیا پہ کرم کردے
توڑ مرے مالک	پیار کی سینوں میں
ظلمات کے گھیروں کو	پھر روشنیاں بھر دے

دعائیہ اور حمدیہ ماہیوں کے بعد حیدرقریشی کے چند نعتیہ ماہیے ملاحظہ فرمائیں انہوں

نے حضور اقدس ﷺ کی فضیلت اور سیرتِ طیبہ کو اجاگر کیا ہے۔

پھیلے تھے اُجالے سے
سب صبحوں کا تاج ہوئی
کملی والے کے
رحمتِ عالم کو
پُرنور حوالے سے
جس شب معراج ہوئی

تاریک تھی کالی تھی
تیرے مدثر نے
جب دنیا اُجالی تھی

چونکہ شاعری الہامی کیفیات کا مظہر ہوتی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ حیدر قریشی کی مذکورہ بالا حمدیہ اور نعتیہ الہامی کیفیات ان کے اندر موجود ایمان کی پختگی کی عکاس ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ شہرِ دل کو شہرِ مدینہ اور محبت کے جذبے کو نور جیسی رحمت کی شکل میں تمام بنی نوع انسان کے سینوں میں درخشاں دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔

دل شہرِ مدینہ ہو
نورِ محبت سے
روشن ہر سینہ ہو

حمدیہ اور نعتیہ ماہیوں کے بعد وہ ماہیے دیکھیں جن میں ہماری مشرقی روایات اور تہذیب وتمدن کے مطابق محبوب کے حسن، ہجر ووصال، چھیڑ چھاڑ، دیوانگی، بے چینی اور عہدوپیمان کے مضامین ملتے ہیں۔ پہلے وہ ماہیے ملاحظہ کریں جن میں محبوب کے حسن کی تعریف کی گئی ہے۔

ان ماہیوں کو میں نے مزید دو حصوں میں تقسیم کیا ہے کچھ وہ جن میں محبوب کی براہ راست تعریف کی گئی ہے اور کچھ وہ جن میں محبوب کے خوب صورت جسمانی اعضاء، لباس اور چال چلن کی تعریف شامل ہے پہلے وہ ماہیے دیکھیں جن میں محبوب کی براہِ راست تعریف کی گئی ہے۔

سوہنی ہے نہ ہیر ہے وہ	مستی ہے ہواؤں میں
اس کی مثال کہاں	رات کی رانی کی
آپ اپنی نظیر ہے وہ	خوشبو ہے فضاؤں میں

رنگت مرے خوابوں کی	پھولوں سے بھرا آنگن
اس کے بدن میں ہے	جیسے کسی الہڑ
خوشبوسی گلابوں کی	دوشیزہ کا ہو جوبن

کوئی وہم یا جادو تھا
رنگ ہَوا اس کا
جسم اس کا خوشبو تھا

مذکورہ بالا ماہیوں میں شاعر نے کہیں اپنے محبوب کو بے مثال کہہ کر کہیں اپنے محبوب کو مہکتی ہوئی رات کی رانی سے تشبیہ دے کر، کہیں اس کے جسم کو گلاب کہہ کر کہیں خوشبو کہہ کر اور کہیں محبوب کی جوانی کو پھولوں سے تشبیہ دے کر خوبصورت پیرائے میں تعریف کی ہے۔اب وہ ماہیے دیکھیں جن میں محبوب کے خوبصورت اور دلکش جسمانی اعضاء کی تعریف کی گئی ہے۔

کچھ ہم نے ہی پی لی تھی	وہ نین غزالی تھے
یا پھر سچ مچ ہی	فیصلہ کیا ہوتا
وہ آنکھ نشیلی تھی	سب ان کے سوالی تھے

اب وہ ماہیے ملاحظہ فرمائیں جن میں دیوانگی کی شدت اور تڑپ جھلکتی نظر آتی ہے دراصل یہی شدت سچے عاشق کے خالص جذبات اور خلوص کا اظہار کرتی ہے۔

جوگی کے نہیں پھیرے	پھرتے ہیں اکیلے میں
دل جہاں آجائے	ساتھ نہیں کوئی
وہیں ڈال دیئے ڈیرے	صدمات کے میلے میں

بے نام اداسی کو
کون سمجھ پاتا
تیرے بن باسی کو

پنجابی ماہیوں میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ کے مضامین تو شروع سے ہی باندھے گئے ہیں مگر اردو ماہیا نگاروں میں چھیڑ چھاڑ کے مضامین حیدرقریشی کے علاوہ کسی نے نہیں باندھے ۔ میں سمجھتا ہوں اس لحاظ سے انہیں یہ انفرادیت حاصل ہے کہ اردو ماہیوں میں چھیڑ چھاڑ کے مضامین لکھتے وقت انہوں نے ہی اولیت حاصل کی ہے۔

کلیوں کی چٹک بھی تھی
سانولی لڑکی میں
اُپلوں کی مہک بھی تھی

گل عشق کی شان تھی
لت پت ہونا تھا
یہ فصل ہی دھان کی تھی

نیت تھی مری کھوٹی
تم بھی تھے آمادہ
اور کھلتی گئی چوٹی

مونجی کی چھڑائی تھی
پہلے پہل بلیئے
جب آنکھ لڑائی تھی

دیکھا جو کمادوں کو
جان گئی سجنی
ساجن کے ارادوں کو

اک جانگلی لڑکی سے
پیاس میں لسّی ہی
پھر مانگ لی لڑکی سے

ان ماہیوں میں محبوب سے آنکھ لڑانا، لڑکی سے لسّی مانگنا، کمادوں کو دیکھ کر ساجن کے ارادوں کو بھانپ لینا، نیّت کی کھوٹ اور محبوب کی چوٹی کا کھل جانا، فصل کی دھان میں محبوب کا لت پت ہونا اور سانولی لڑکی سے ملنے کے بعد اُپلوں کی مہک محسوس کرنا' چھیڑ چھاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماہیوں میں لطف کا سماں پیدا کررہے ہیں۔

ہجروو صال بھی اردو ماہیے کا ایک اہم موضوع ہے حیدرقریشی کے ہاں آنے والی

جدائی کا دکھ اور ملاقات کی خواہش اکثر جگہوں پر ہم آہنگ ہوکر ایک عجیب قسم کی چاشنی کا مزہ دیتے ہیں۔مثال کے طور پر وہ اپنے اس ماہیے میں محبوب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے شکوہ سرا بھی ہیں کہ ہمارے ملنے کے دن بہت کم ہیں اور اس کے بعد ہماری قسمت میں لمبی جدائی ہے۔

دن وصل کے تھوڑے ہیں
جی بھر کے مل لو
پھر لمبے وچھوڑے ہیں

لمحات حضوری میں
فرق نہیں رہتا
قربت اور دوری میں

جھک آئے فلک سائیں
دیکھی تھی ہم نے
بس ایک جھلک سائیں

اب وہ ماہیے ملاحظہ فرمائیں جن میں ماضی کے محبوب ،محبوب کی محبت اور گزرے ہوئے زمانے کی یاد دل کو ستاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حیدر قریشی ایسے ماہیوں میں جہاں پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھتے ہوئے ان دنوں کو اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں وہیں اس زمانے سے جدائی کا دکھ بھی ان کے احساسات میں کرب کی روشنی بھر دیتا ہے۔

چمبیلی کی کلیاں تھیں
اپنی جوانی تھی
اور شہر کی گلیاں تھیں

دوپہر جوانی تھی
پل میں بیت گئی
پھر شام سہانی تھی

خوشیوں کی گھڑی آئی
آنکھ کے صحرا میں
یادوں کی جھڑی آئی

ایک یاد تھی بستے میں
کھوگئی جانے کہاں
اس عمر کے رستے میں

تختی کو سکھاتے تھے
خواب سہانے تھے
پر دل کو دکھاتے تھے

وہ سرسنگیت گیا
قلم دواتوں کا
اک دور تھا، بیت گیا

چاہت کی گواہی کا
کھیل لڑکپن کا
تھا "چورسپاہی" کا

حیدرقریشی کے مذکورہ بالا ماہیے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے والے ماہیے ہیں۔ ان کے مطالعے کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان ماہیوں نے پڑھنے والے کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ دراصل ان ماہیوں میں بیان کردہ مناظر، اوراحساسات کو "چمبیلی کی کلیوں، بستے میں رکھی یادوں، جوانی کی دوپہر، تختی کو سکھانے، قلم دواتوں کے زمانے اور لڑکپن کے کھیل "چورسپاہی" جیسی تشبیہات کے ساتھ ایسے واضح کیا گیا ہے کہ ماہیے کی ہر سطر گزرے ہوئے زمانے کے تمام زخم تازہ کردیتی ہے اور انسان کے دل میں گزرے ہوئے زمانے کا دکھ ہوک بن کر سامنے آتا ہے۔ اب وہ ماہیے ملاحظہ فرمائیں جن میں مذکورہ بالا ماہیوں سے ہٹ کر محبوب کی جدائی کا دکھ ظاہر کیا گیا ہے۔

آنکھوں میں ستارے ہیں
ہجر کی شب میں
وہ پاس ہمارے ہیں

بے کار کے رونے سے
کچھ بھی نہیں ملتا
پانی کو بلونے سے

جاں وار گئے پیارے
جگ تمہیں جیت گیا
ہم ہار گئے پیارے

چاہت کی گواہی تھے
ہم بھی کبھی یارو
اک ہیر کے ماہی تھے

ان ماہیوں کے علاوہ حیدرقریشی نے ایسے ماہیے بھی تخلیق کئے ہیں جن میں ان کی محرومی اور مایوسی شکوے کی صورت میں ان سے ہم کلام ہے۔

چلنے کو ترستے ہیں
منزل گم ہے کہیں
بکھرے ہوئے رستے ہیں

جنموں کی اداسی ہے
جسم ہے آسودہ
پر روح تو پیاسی ہے

دکھ حق تھا غریبوں کا
تم سے گلہ کوئی
نہ ہی شکوہ نصیبوں کا

حالات کے دھارے سے
آن لگے آخر
ہم اپنے کنارے سے

مرجھائے درختوں کو
دیں گی بہاریں کیا
ہم سوختہ بختوں کو

کچھ قید سنا دیتے
عشق کے مجرم کو
کوئی تو سزا دیتے

اپنی دھرتی سے محبت اور اپنے شہروں اور دیہاتوں کے حسن کی تعریف بھی اردو ماہیے کا ایک اہم موضوع ہے۔ حیدر قریشی نے اس حوالے سے سب سے زیادہ جاندار ماہیے تخلیق کیئے ہیں۔ جن میں وطن سے بے حد محبت، اسکے حسن کی تعریف اور اسکے ثقافتی مظاہر کا حسن خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے ان کے کچھ ایسے ماہیے دیکھیں جن میں دھرتی کے ظاہری حسن کو جھومر، افشاں، زلفِ پریشاں اور چاند ستاورں جیسی تشبیہات اور علامتوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

مُکھ دھرتی کا نورانی
جھومر پیڑ اسکے
کھیت اسکی ہیں پیشانی

باغات کی افشاں ہے
اور حسیں جنگل
کی زلف پریشاں ہے

چاند اور ستارے ہیں
ہم سب اس دھرتی
کے راج دلارے ہیں

پگڈنڈیوں کے دل دھڑکیں
بستی میں پکی
جب بچھنے لگیں سڑکیں

حیدر قریشی نے دھرتی کے حوالے سے ایسے ماہیے بھی تخلیق کئے ہیں جن میں دیہات کی دوپہروں ، گندم کی کٹائی، کلیوں کی مہکار اور صبح کے وقت دودھ بلونے کی آواز کا ذکر دیہات کے خالص ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اور ایسا جبھی ممکن ہوسکتا ہے جب شاعر نے گاؤں یا دیہات کے یہ مناظر بہت قریب سے دیکھے ہوں یا اسی ماحول میں پرورش پائی ہو اور ان لمحات کا حساس نظری سے مشاہدہ کیا ہو۔

منظر تیرے گاؤں کے
گرم دوپہرں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

کھیتوں کے کنارے ہیں
دور تلک پھیلے
فصلوں کے نظارے ہیں

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر

شیشم کی قطاریں ہیں
لو کے تھپیڑوں میں
راحت کی بہاریں ہیں

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہو ولیوں کی

جھنکار بلونے کی
مظہر گاؤں میں
ہر صبح کے ہونے کی

مذکورہ بالا ماہیوں میں شاعر نے گاؤں کے مختلف خوبصورت مناظر بیان کر کے گاؤں کے حسن کی تعریف کی ہے۔ اب ایسے ماہیے دیکھیں جن میں دھرتی کے ثقافتی مظاہر اپنی پوری آن بان کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔

مستی سے بھری پہلی
الہڑ مٹیاریں
جب کھیل گئیں ککلی

چلتے رہیں ہل بلیئے
محنت والوں کو
ملتے رہیں پھل بلیئے

جب ماہیے کی بات آئی
ساتھ ہی سکھیوں کے
پیتل کی پرات آئی

ان ماہیوں میں "الہڑ مٹیاریں" " ککلی کا کھیل" "ہل کا چلنا" اور " پیتل کی پرات" ہماری دھرتی کے ثقافتی اظہار کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔

حیدر قریشی نے دیگر اہم موضوعات ماہیے کے حسن میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ اپنے ماہیوں میں رشتے ناتوں کا ذکر بھی بخوبی کیا ہے ۔والدین کے حوالے سے ماہیے لکھتے وقت انھوں نے ماں، باپ کی محبت اور دعاؤں کا ذکر اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ ان کے رشتے ناتوں کے حوالے سے لکھے گئے ماہیے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں ماں، باپ کی دعائیں، بیٹوں کی محبت اور بیوی کا ساتھ ان کی زندگی میں بہار بن کر مسکراتا دکھائی دیتا ہے۔ پہلے والدین کے حوالے سے تخلیق کردہ ماہیے دیکھیں۔

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اس کی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

برگد کی جٹائیں ہیں
ساتھ مرے اب بھی
ابو کی دعائیں ہیں

لگتی تھی دُعا ماں کی
نیم شبی شبنم
اور چاندنی کی جھانکی

اب بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے لکھے گئے ماہیے ملاحظہ کریں۔

دریا کی روانی ہے　　مری چڑیوں کی جوڑی ہے
اب مرے بیٹوں میں　　اک پہلوٹھی کی
مری گزری جوانی ہے　　اک پیٹ کھروڑی ہے

اور اب شریکِ حیات سے محبت کا اظہار دیکھیں جس میں ایک طرف تو وہ اپنے ہم سفر کو اپنے بدن کا حصہ کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں اور دوسری طرف نقاد کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے اس کے اوصاف کا تجزیہ کر رہے ہیں۔

اک روح کا قصہ ہے　　سونے کی انگوٹھی ہے
میرے بدن ہی کا　　پیار میں سچی ہے
جو گم شدہ حصہ ہے　　پر قول کی جھوٹی ہے

حیدر قریشی نے کچھ ماہیے شادی بیاہ کی تقریب کے حوالے سے بھی لکھے ہیں جن میں ہماری مشرقی روایات، مہندی کی مخصوص رسموں، رخصتی اور بارات کے مناظر کو الفاظ کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔

اظہار محبت کے　　اقرار کی گھڑیاں ہیں
پھول وفاؤں کے　　جگمگ کرتی ہوئی
اور ہار محبت کے　　یہ سہرے کی لڑیاں ہیں

کیا روپ ہے دلہن کا　　شب تاب نظاروں سے
سچی محبت ہی　　مانگ رہے روشن
زیور کا سہاگن کا　　افشاں کے ستاروں سے

یہی رسم زمانہ ہے
بابل کے گھر کو
اب چھوڑ کے جانا ہے

رخصت کی گھڑی آئی
دل ماں کا دھڑکا
آنکھوں میں جھڑی آئی

بارات کا منظر ہے
خوشیوں کا موسم
برسات کا منظر ہے

اشکوں کی صداؤں میں
رُخصتی ہوتی ہے
خوشیوں کی دعاؤں میں

ابریشمی خوابوں سے
سیج سدا مہکے
چاہت کے گلابوں سے

پہلے پہلے لوک ماہیے کی صورت میں زیادہ تر مکالماتی ماہیے کہے جاتے تھے۔ ہمارے پنجابی دیہات کی زبان چونکہ پنجابی تھی اس لیے یہ لوک مکالماتی ماہیے بھی پنجابی میں ہی کہے جاتے تھے اور میلوں ٹھیلوں میں گائے جانے کے بعد زبان زدِ عام ہو جاتے تھے۔ بعد میں با قاعدہ طور پر پنجابی اور اردو کے شعراء نے بھی مکالماتی ماہیے لکھے جو اپنے وقت میں مشہور بھی ہوئے لیکن زیادہ شہرت ساحر لدھیانوی کے ماہیوں کو حاصل ہوئی۔ ساحر لدھیانوی کے بعد کئی ماہیا نگاروں نے مکالماتی ماہیے پر طبع آزمائی کی مگر اس سلسلے کا کوئی مکالمہ بھی عوام کے دلوں میں گھر نہیں کر سکا۔ میں نے حیدر قریشی کے مکالماتی ماہیوں میں ساحر لدھیانوی جیسا انداز اور تڑپ محسوس کی ہے جو کہ ان کے مکالماتی ماہیوں کے روشن مستقبل کی بشارت ہے ان کے مکالماتی ماہیے ملاحظہ کریں۔

مرد۔ کتنے بدنام ہوئے
پیار میں تیرے ہم
پھر بھی ناکام ہوئے

عورت۔ ناکامی سے ڈرتے ہو
عشق بھی کرتے ہو
بدنامی سے ڈرتے ہو

مرد۔ اس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں

عورت۔زلفوں سے رہا ہو جا
رب تیری خیر کرے
جا ہم سے جدا ہو جا

مرد۔ کیا لطف رہائی کا
دل جب سہہ نہ سکے
دکھ تیری جدائی کا

عورت،مرد۔ملنا ہو تو ملتے ہیں
پھول محبت کے
پت جھڑ میں بھی کھلتے ہیں

آخر میں حیدر قریشی کے چند ملے جلے تاثرات کے ماہیے ملاحظہ فرمائیں۔

جھجھری بھی بجاتے ہیں
تال پہ تالی کے
جب ماہیے گاتے ہیں

آسان سفر کرلو
آنکھوں کو دریا
اور دشت کو گھر کرلو

بے دوش چناروں پر
پھل کیسے آتے ہیں
تقدیر کے ماروں پر

یہ دل بھی لگا کھلنے
لہنگا ہرا پہنے
آیا ہے کوئی ملنے

آنکھوں سے گماں تک کا
اپنا سفر سارا
تھا جسم سے جاں تک کا

نہیں، ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

بے کار کے رونے سے
کچھ بھی نہیں ملتا
پانی کو بلونے سے

سورج ان ہاتھوں میں
اور ستاروں کے
اسرار ہیں باتوں میں

سب دکھ کے فسانے تھے
آنکھ کے آنسو تھے
یا اوس کے دانے تھے

پت جھڑ کی ہوائیں تھیں
سہمے پرندوں کے
ہونٹوں پہ دعائیں تھیں

(مطبوعہ سہ ماہی **ادبِ عالیہ انٹرنیشنل**۔ وہاڑی، پاکستان۔
شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۲ء)

شاعری پر مختلف ادیبوں کے ملے جلے تاثرات

مجروح سلطان پوری،ڈاکٹر وزیر آغا،سید ضمیر جعفری، گیان چند جین،ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر انور سدید، کالی داس گپتا رضا،ادیب سہیل،ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ،ڈاکٹر شفیق احمد،ڈاکٹر ناصر عباس نیر،احمد ہمیش،انوار فیروز،ہارون الرشید ہارون،ڈاکٹر غلام شبیر رانا،غزالہ طلعت، ڈاکٹر فرحت نسیم ہاشمی،مسعود منور، نجمہ منصور،اکبر حمیدی،فیصل عظیم،نذیر فتح پوری،ڈاکٹر سعادت سعید،شگفتہ الطاف،نیاز احمد صوفی۔



مجروح سلطانپوری(ممبئی)

☆☆آپ کی کتاب (سلگتے خواب) پر لکھے ہوئے آراء سے مجھے پورے طور پر اتفاق ہے۔آپ کی شاعری میں تازگی لانے کی سعیِ جمیل کا پتہ چلتا ہے۔روایت میں درایت کا رویہ!

ڈاکٹر وزیر آغا(سرگودھا)

حیدر قریشی کے غزلیہ اشعار میں محبت کا کیف وکم شاعر کو مبہوت اور بے خود کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔محبت کا یہ تجربہ ایک سچا اور کھرا جسمانی تجربہ ہے اور اسی لئے اس سے پھوٹنے والا کرب اور زیاں کا احساس بھی سچا ہے۔اگر حیدر قریشی کی جگہ کوئی اور شاعر ہوتا تو محبت میں ناکامی کے بعد صوفیانہ مسلک کے تحت محبت کے جذبے کو منقلب کر لیتا یا پھر آہ وزاری کو اپنا مسلک بنا کر حدیث دل سناتا چلا جاتا یا اگر ترقی پسند جذبات سے سرشار ہوتا تو محبوبہ کو اپنے آنچل کا پرچم بنا لینے کا مشورہ دیتا۔مگر حیدر قریشی نے محبت کے کربناک تجربے کو اور ہی زاویے سے دیکھا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ہاں زیرِ لب تبسم کی نمود ہوئی ہے جو جذبے کی بے معنویت کو اُجاگر کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔

ایک ایسے شخص کا تصور کیجیے جس کا ایک ہاتھ تو اپنے سینے میں سلگتے ہوئے درد پر رکھا ہو اور دوسرے ہاتھ سے وہ زندگی کو معنی خیز اشاروں سے چڑا رہا ہو تو آپ کو حیدر قریشی کے اس رویے کا کچھ اندازہ ہوگا۔

سید ضمیر جعفری (اسلام آباد)

حیدر قریشی اردو غزل کے نئے افق پر ایک سپوتنک کی طرح بلند ہونے والے ہمارے چند نوجوان شعراء میں شامل ہے۔ حیدر کا شعر دردمند بھی ہوتا ہے اور خوش آہنگ وخوش رنگ بھی۔ وہ اپنی تخلیقی فصل کے کسی خوشے، بالی، ٹانڈے کو دیمک نہیں لگنے دیتا۔ اڑتا ہے تو زمین کو ساتھ لے کر اڑتا ہے۔ ہماری جدید غزل میں ایسی اجلی اور پھر ایسی ''مٹیالی'' شاعری کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ میرے نزدیک حیدر قریشی شعراء کے اس عمدہ گروہ کے سرپنچوں میں سے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو جدید غزل کی وہ ساکھ نہ ہوتی، جو ہے۔

گیان چند جین (امریکہ)

☆☆ کتاب ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کے لئے تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ کی شاعری مجھے پسند آئی۔ اچھے موڈ میں تھا اس لئے ورق گردانی کرتے وقت کتاب کی ہر غزل اور نظم اچھی لگی۔

ڈاکٹر وحید قریشی (لاہور)

☆☆ میں آپ کی شاعری کا مداح بلکہ دلدادہ ہوں۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

☆☆ حیدر قریشی کو اس کی دور افتادگی نے ہی سہارا دیا ہے۔ وہ مزاجاً اور طبعاً دیہات کا شاعر ہے اور شہر کے آداب معاشرت سے کچھ زیادہ واقف نہیں۔ شہر کو ایک مخصوص

رنگ میں دیکھنے اور اسے کردار بنا کر پیش کرنے کے باوجود حیدر قریشی نے اسکی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا۔ بلا شبہ وہ مسرت اور غم ،طمانیت قلب اور بے اطمینانی،تسکین اور تشویش اور اضطراب غرضیکہ ہر مثبت اور منفی جذبے کو محسوس کرتا ہے لیکن انہیں تہذیب کی درانتی سے کاٹنے اور اس پر شہریت کا غازہ ملنے کی کوشش نہیں کرتا۔ حیدر قریشی تو آرائش نقش ونگار پیدا کئے بغیر شعر کا داخلی اور خارجی حسن ابھارتا ہے۔ شاید اس کی سادگی ہی اس کا حسن ہے۔شاید اس کی خود روئیدگی ہی اس کا وقار ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ اس کی پر اعتماد آواز قاری کا تعاقب کرتی ہے اور اسے دعوت دیتی ہے کہ وہ مڑ کر دیکھے اور اس آواز پر لپک کر پتھر ہو جائے

کالیداس گپتا رضا(ممبئی)

حیدر صاحب کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جو روایت اور نئے پن کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اس قسم کے اشعار کہنا آسان نہیں، پہلے پہلے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے پھر مشق ہو جانے پر ایسے خوبصورت اشعار لاشعوری طور پر نوک قلم پر جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔

ادیب سہیل(کراچی)

☆☆حیدر قریشی کی شاعری محض نظارے کی شاعری نہیں،شمول کی شاعری ہے۔یہ شمولیت غمِ جاناں کی بھی ہوسکتی ہے اور غمِ دوراں کی بھی۔غمِ جاناں کا تعلق محبت سے ہے اور غمِ دوراں کا تعلق مشقت سے۔ کتاب کا نام”سلگتے خواب“اور اس کے اندر کا مواد دونوں طرح کی شمولیت کا اعلان کرتا ہے۔اس تیور اور زندہ لہجے کے شاعر کی خو محض تماشہ بین نہیں ہوسکتی۔عصری آگہی کی اصطلاح صحیح معنوں میں اس طرح کی شاعری پر صادق آتی ہے۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ (جرمنی)

☆☆حیدر قریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے۔ایک بار پڑھنا شروع

کیا تو جی چاہا پڑھتی ہی رہوں۔دوسرا اہم وصف بے باکی اور وارفتگی کا ہے جو حیدر قریشی کی شاعری میں نمایاں ہے۔

ڈاکٹر شفیق احمد (بھاولپور)

☆☆ اُردو شاعری کے بہت سے شعراء کے شعروں سے اُن کی زندگی کے اہم واقعات کا سراغ مل سکتا ہے لیکن میری دانست میں حیدر قریشی اردو کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنے بارے میں اپنی شاعری ہی میں بہت کچھ بتادیا ہے اتنا کچھ کہ اگر کوشش کی جائے تو اُن کی ایک مکمل سوانح عمری مرتب کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر (لاہور)

☆☆ حیدر قریشی کے لیے تخلیق شعر کا عمل کشف اور سیاحت باطن کا وسیلہ ہے چنانچہ وہ ایک الگ اور اپنی راہ پہ چلے ہیں (اور یہ راہ ایک حد تک اردو شاعری کے جدید اور جدید تر رجحان سے ہم رشتہ ہے)۔حیدر قریشی کی شاعری میں محبت کا جو انداز اُبھرا ہے اس کی دو سطحیں بہت نمایاں ہیں پہلی سطح پر شاعر اپنی محبوبہ سے ایک گوشت پوست کے انسان کی طرح ملتا اور لپٹتا نظر آتا ہے چونکہ یہ محبت یک طرفہ نہیں اس لیے شدت جذبات کی گرمی نیز آبگینے کا تندیٔ صہبا سے پگھلنے کا منظر بھی موجود ہے(جو دراصل حیاتیاتی طلب کے شدید ہونے کا لازمی نتیجہ ہے)۔دوسری سطح وہ ہے جہاں شاعر کو محبوبہ کا وصل محض ایک خواب دکھائی دیتا ہے وہ اس سے مل کر حسی اور ذہنی لذت کے چند ناقابل فراموش لمحے ارزانی کر کے غالباً ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتی ہے نتیجتاً شاعر تنہائی ، یاد ، اداسی ، کرب جدائی اور سلگتے خوابوں کے وحشت ناک بگولوں میں گھر جاتا ہے ۔ویسے تو محبت کا یہ تجربہ جو لذتِ وصل اور کرب جدائی کی کیفیات سے مرتب ہوا ہے اچھوتا اور منفرد نہیں ہے شاید ہر انسان اس سے گزرتا ہے مگر حیدر قریشی کی غیر معمولی حساسیت نے اس "معمولی تجربے" کو باندازِ دگر محسوس کیا ہے۔

احمد ہمیش (کراچی)

☆☆ حیدر قریشی نے صنفِ شاعری کی ہر فارم خاص طور پر غزل،نظم اور ماہیے میں اپنی علیحدہ پہچان بنائی۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

☆☆ حیدر قریشی نے بڑی محنت ،خلوص اور لگن کے ساتھ اپنا شعری سفر جاری رکھا اور ایک نئی جہت اختیار کی۔ان کے وژن میں وسعت پیدا ہوئی۔۔۔۔مجھے خوشی ہے کہ حیدر قریشی کا شعری سفر رفتار کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

ہارون الرشید (ایبٹ آباد)

☆☆ حیدر قریشی کے ماہیوں میں موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔اس سے لگتا ہے کہ وہ غزل اور نظم کے ساتھ ماہیے کو بھی نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔اس کے اندر انہوں نے اپنے جو تجربات منتقل کئے ہیں وہ ان کی ماہیے سے گہری وابستگی کے مظہر ہیں۔اور یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ ماہیے کا مستقبل نہایت تابناک ہے اور اس میں حیدر قریشی کے ماہیے اور ان کا اس کے فروغ کے ضمن میں کردار یقیناً ہمیشہ باقی رہے گا۔

غلام شبیر رانا (جھنگ)

☆☆ میں ایک طویل عرصے سے آپ کی بے پناہ شعری صلاحیتوں کا معترف اور لائق صد رشک علمی فضیلت اور ادبی مقام کا معتقد ہوں۔آپ کی محبت سے میرا دامن معطر ہے۔اردو ماہیے کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں آپ نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا اعجاز ہے کہ اس صنف کی جانب بہت سے ذہین لکھنے والے متوجہ ہو گئے ہیں۔۔۔مجھے آپ کے خیالات سے مکمل اتفاق ہے۔

غزالہ طلعت (خان پور)

☆☆حیدر قریشی کی غزل میں اس کے دکھ اور اس کی خوشیوں کا انداز ایسا ہے کہ یہ سب اپنا اپنا سا لگتا ہے۔قاری کے دل میں اس طرح گھر کر لینا حیدر قریشی کی غزل کی کامیابی کا ثبوت ہے۔۔۔حیدر قریشی کی شاعری غزل،نظم اور ماہیا تینوں میں اپنا جادو جگاتی ہے۔اس کی شاعری پڑھتے ہوئے بعض اوقات ایسی کیفیت ہوجاتی جو غالب کے کہنے کے مطابق۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے،اور جب یہ کیفیت نہیں ہوتی تب اس کی شاعری ویسے ہی سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ان دو کے سوا کوئی تیسری کیفیت یا حالت حیدر قریشی کی شاعری میں نہیں ہے۔گویا قاری کے لیے کوئی جائے فرار نہیں ہے۔

فرحت نسیم ہاشمی (راولپنڈی)

☆☆میرے نزدیک حیدر ایسے شاعر ہیں جو ہر جذبے،ہر درد،ہر غم ،ہر کرب ،ہر رشتے میں دھڑکتے دل کی ہر کیفیت کو بہت گہرائی کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور پھر اسے لفظوں میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔حیدر کی شاعری بظاہر کاغذ پر لکھی گئی ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے پڑھنے والوں کی قلبی سر زمین پر لفظوں اور حرفوں کی ایک بڑی فصل اُگا رہے ہیں،جس میں کھلنے والے مہکتے پھول پڑھنے والوں کے کئی لمحوں کو مہکا دیتے ہیں اور امید کے ایسے در وا کرتے ہیں کہ پڑھنے والا دیر تک اس سحر سے آزاد نہیں ہوتا۔

مسعود منور (ناروے)

☆☆آپ کی ساری غزلیں پڑھ لی ہیں۔ابھی تک نشے میں ہوں۔زندہ باد!۔

نجمہ منصور (سرگودھا)

☆☆پوری کتاب (سلگتے خواب) مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے اسے بار بار پڑھا اور ہر بار ایک نیا پن محسوس کیا۔آپ کا ہر شعر قاری کو اپنی طرف اس طرح متوجہ کرتا ہے کہ نہ

صرف وہ اسے پڑھتا ہے بلکہ دل میں اتار لیتا ہے۔

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

☆☆''ماہیا'' پنجابی شاعری کی مشہور مقبول صنف ہے۔اردو میں حیدر قریشی نے اسے رائج کیا اور کچھ اس طرح رائج کیا کہ ماہیا ماہیا کرتا وہ خود ماہیا بن گیا۔اس نے اس صنف کا پودا اردو کی سرزمین میں کچھ یوں کاشت کیا کہ اس کی آبیاری کے لئے لکھنے والوں کی ایک بڑی ٹیم جمع کر لی۔ماہیا کے لئے وضاحتی اور تعارفی مضامین بھی لکھے اور ماہیئے بھی۔اب بھی ''جدید ادب'' کے سرِ ورق پر ماہیا باقاعدگی سے چھپتا ہے۔اردو ماہیا پر حیدر قریشی کا کام اس قدر وقیع اور وسیع ہے۔کہ اردو ماہیا کی تاریخ میں اس کا نام امر ہو گیا ہے۔

فیصل عظیم (امریکہ)

☆☆ماہیے کو زندہ رکھنا تو خیر ایک ''فرضِ منصبی'' جیسی اصطلاح معلوم ہوتی ہے اور ایک تخلیق کار کا خون جب لفظوں کی رگوں میں دوڑ کر انہیں ماہیا' غزل' نظم' افسانہ یا کسی اور صورت میں زندگی دے یا یوں کہیے کہ اس کے چہرے پر اپنے رنگ بکھرا جائے تو صنف کی حفاظت پر بات کر کر کے ہم دراصل تخلیق اور تخلیق کار دونوں کی روحوں کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ ماہیے کو ''پروان چڑھانے'' کے حوالے سے حیدر قریشی صاحب کا ذکر بارہا ہوا ہے اور ہوتا رہے گا مگر اہم بات ان کا کلام ہے جو اس صنف میں بھی اتنا ہی توانا اور تازہ ہے جتنا غزل اور نظم میں' ورنہ غور کیجئے تو لوگ صنف سے جڑ کر تخلیق کی خوبصورتی اور گہرائی کے بجائے سطحی عوامل' مثلاً ہندی/ فارسی لغت یا لہجے میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور تخلیق کے بجائے صنف کی خدمت کے حوالے سے پہچانے جانے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ایک مستند' نابغۂ روزگار ادیب کی یہی سب سے بڑی پہچان ہے کہ وہ ان ''تجاوزات'' کے پیچھے چھپ نہیں جاتا اور حیدر قریشی صاحب کی زبردست تخلیقی صلاحیت اس بات کا ثبوت ہے۔

نذیر فتح پوری (پونہ)

☆☆حیدر قریشی نے اپنے پہلے خط میں اسی جانب میری توجہ مبذول کرائی۔دوسرے یا تیسرے خط میں انہوں نے مجھے اپنا ایک غیر مطبوعہ مضمون بھی ارسال کیا جس کا عنوان تھا'' ماہیا اور اس کا دوسرا مصرعہ''۔میں چونکہ بنیادی طور پر تخلیقی ذہن کا آدمی ہوں۔بحر و وزن کے چکّر میں پڑے بغیر براہِ راست تخلیقی میدان میں اتر جاتا ہوں۔مجھے حیدر قریشی کی بات میں ایک قسم کا ادبی چیلنج دکھائی دیا۔میں نے اپنے پرانے ماہیوں کے دوسرے مصرعوں کو الٹ پلٹ کر حیدر قریشی کے بتائے ہوئے وزن پر مصرعے ڈھالنے شروع کر دیئے اور بہت جلد بہت سے ماہیے حیدر قریشی کو ارسال کر دیئے۔حیدر قریشی کی جانب سے ماہیوں پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔اور پھر انہیں کی ایماء پر پہلی فرصت میں میں نے ''ریگِ رواں'' کے عنوان سے اپنے ماہیوں کا مسودہ تیار کر کے حیدر قریشی کو ارسال کر دیا جس کی اشاعت ۱۹۹۷ء میں امین خیال کی زیرنگرانی گوجرانوالہ پاکستان سے ہوئی۔تب سے اب تک ہم دونوں کے درمیان ادبی رشتے مستحکم ہوتے چلے گئے۔

ڈاکٹر سعادت سعید (لاہور)

☆☆حیدر قریشی کے ماہیے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے جہاں ایک طرف اپنے ارد گرد کی زندگی کو ایک مفکر کی آنکھ سے دیکھا ہے وہاں دوسری طرف انسان کی عمومی خوشیوں،یادوں،سوگواریوں،غموں،آسوں، امیدوں،حسن پرستیوں، شاہدوستیوں، آنسوؤں، قہقہوں،ستم ظریفیوں، بیوقوفیوں،تنہائیوں،حضوریوں،مہجوریوں اور دوریوں کا پرتاثیر انداز سے جائزہ لیا ہے۔

شگفتہ الطاف (بھاولپور)

☆☆حیدر قریشی کی ادبی شخصیت کو پرکھا جائے تو اسے مختلف الجہت شخصیت کا نام دیا جاسکتا ہے۔حیدر قریشی نے اگر چہ تحقیق اور نثر میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں لیکن

شعری اصناف میں غزلیں۔نظمیں اور ماہیے حیدر قریشی کے خاص میدان ہیں جن میں ''ماہیے'' سے حیدر قریشی کی خصوصی رغبت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔گزشتہ چند دہائیوں میں جو تحریک اردو ماہیے کے حوالے سے پروان چڑھی ہے اس میں اردو ماہیے کو فروغ دینے والوں میں اہم ترین نمایاں نام حیدر قریشی کا ہے۔یوں لگتا ہے کہ حیدر قریشی اس عوامی صنف کو اردو زبان کی رنگت اوڑھے نئے اسالیب اور نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ عوام الناس میں پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے ہیں۔اس رغبت میں جہاں حیدر قریشی کی موزوں شعری طبعیت نے بہت سے خوبصورت ماہیے تخلیق کیے وہاں فکری اعتبار سے ماہیے کی ہئیت' مزاج اور عروضی پیمانے پر نقد ونظر کا کام بھی کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔حیدر قریشی کے ماہیوں میں صداقتوں کا پہلو بہت مضبوط پہلو ہے۔وہ ہر منظر نامے کا جائزہ بہت قریب سے لیتا ہے کیوں کہ اسے معاشرتی عذابوں اور تاریخی حوالوں کو بھی انصاف سے رقم کرنا ہے حیدر قریشی کے موضوعات میں دکھ درد کے موسم ہوں کہ وصال کے لمحات چونکہ وارداتِ قلبی کو چھو کر الفاظ ہوئے ہیں اس لیے خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔

نیاز احمد صوفی (لاہور)

☆☆پچھلے چند برسوں میں پنجاب کی کنواریوں کے ہونٹوں پر تھرکنے والا یہ مدُھر گیت اردو شاعری میں اپنا مقام بنا چکا ہے اور اس ٹرانسفارمیشن میں حیدر قریشی صاحب نے منفرد رول ادا کیا ہے۔جس ہنر مندی اور احتیاط سے انہوں نے اردو ماہیا کہا ہے وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ ماہیے پر بہت بڑا احسان ہے کہ اب ماہیا دیہات کی پگڈنڈیوں سے تو جدا نہیں ہوا مگر شہر کی شاہراہوں پر بھی سایہ کر رہا ہے۔کیا ماہیا اپنے نئے سفر کی نئی منزلوں سے آشنا ہو کر اپنے پرانے گاؤں کو بھول جائے گا؟ قیاس ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔کم از کم جب تک حیدر قریشی جیسے شاعر اور ان کا کلام زندہ رہے گا ماہیا پنپتا رہے گا۔اس میں گنے کے رَس کی مٹھاس' کھیت کھلیانوں کی ہریالی' کہساروں' نہروں اور پیڑوں کا ذکر ہوتا رہے گا۔۔۔۔۔۔۔حیدر قریشی کی کتاب ''محبت کے پھول'' یقیناً اردو ماہیے میں ایک سنگِ میل

کی حیثیت رکھتی ہے۔سب سے خوبصورت بات یہ ہے حیدر قریشی کا اردو ماہیاDiction کی تبدیلی کے باوجود سراسر پنجابی ماہیا ہے اور یہ ان کی بہت بڑی contribution ہے۔انہوں نے موضوع کے اعتبار سے ماہیے کو وسعت ضرور دی ہے مگر اس کی اصلی شناخت کو مجروح نہیں ہونے دیا' بلکہ اس کی چال میں ایک بانکپن آ گیا ہے۔میں ان کے ماہیوں سے بے حد لطف اندوز ہوا ہوں۔Inspire بھی ہوا ہوں۔میرے خیال میں ہر حساس قاری اس مجموعے میں دیئے گئے ماہیوں سے شاعر کی عظمت کا قائل تو ہوگا ہی۔۔۔ساتھ ساتھ وہ پنجابی ماہیے کو ایک نئے رُوپ میں دیکھے گا اور یقیناً اسے سراہے گا۔

ابتدائی ادبی زمانہ

(یادوں کے ایک باب سے اقتباس)

میری بالکل ابتدائی ادبی تربیت میں میرے خاندان کے تین اہم افراد کا لاشعوری عمل دخل رہا۔ان کا میں اپنی بعض تحریروں میں ہلکا سا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ابا جی نے مجھے اسکول جانے سے پہلے جس طرح اردو پڑھنا،لکھنا سکھا دیا تھا وہ میری ادبی تربیت کا پہلا زینہ تھا۔ پھر امی جی کا گھر میں دلچسپی لے کر ناول پڑھنا بھی مجھے ادب کے ساتھ جوڑنے کا ایک سبب بنا۔امی جی نے ایک بار ایک طویل دعائیہ پنجابی نظم لکھی تھی ۔پھر میرے بچپن ہی میں ماموں حبیب اللہ صادق کا شاعر ہونا۔ میں سمجھتا ہوں میرے بچپن کے یہ سارے عوامل میری ادبی تربیت کا سبب بنتے رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے یہ ۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء کا زمانہ تھا ۔میں چھٹی ساتویں میں پڑھتا تھا۔ماموں صادق ڈیرہ اسماعیل خاں سے ہمارے ہاں خانپور آئے تھے۔تب شام کے وقت میں نے اور ابا جی نے ان سے ان کی ایک نظم سنی جو ویت نام کے موضوع پر تھی۔اس کا مرکزی مصرعہ میرے ذہن میں یوں رہ گیا ہے۔

زندہ باداے ویت نام

ماموں صادق کا ترنم شاعرانہ انداز کا تھا۔ مجھے اپنی وہ حیرت آج بھی یاد ہے جب میں ماموں صادق کی نظم سنتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا اور اس دیکھنے میں ایک عجیب سی خوشی اور تفاخر کا احساس شامل تھا کہ میرے ایک ماموں شاعر ہیں!۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جس کو اس کے قسم کے حالات مل جائیں وہ شاعر اور ادیب بن جاتا ہے۔ یہ صلاحیت تو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔صلاحیت بیج کی طرح ہوتی ہے اور جب تک اسے مناسب زمین اورموزوں آب و ہوانہ ملے ان کی نشوونمانہیں ہوسکتی۔میرے پانچوں بچوں میں ایسی خداداد صلاحیت نہیں تھی تو میری ادبی زمین اور آب و ہوا کے باوجود ان میں سے کوئی بھی شاعر اور ادیب نہیں بن سکا۔

اپنے گھر والوں کے مذکورہ اثرات سے ابھرتے ہوئے میں نے سب سے پہلی غزل خانپور میں اپنی نویں کلاس کے اختتام تک کہنے کی کوشش کی۔ یہ غزل کیا تھی۔ بس تُک بندی تھی۔ مصرعوں کی روانی میں کہیں نہ کہیں سقم ضرور ہوں گے۔ میں نے وہ غزل اس زمانہ میں سب سے چوری چھپے لاہور کے فلمی ماہنامہ ''شمع'' کو اشاعت کے لئے بھیجی۔ چند دنوں ہی میں ''شمع'' کی طرف سے جواب آ گیا کہ آپ کی غزل ناقابلِ اشاعت ہے۔ مزید یہ کہ آپ کسی سے اصلاح لیا کریں۔ اس وقت دل کی عجیب حالت تھی۔ کبھی ''شمع'' رسالہ کے ایڈیٹر پر غصہ آتا اور کبھی اپنے آپ میں شرمندگی محسوس ہوتی۔ میں نے اس بات پر خدا کا بے حد شکر ادا کیا کہ گھر والوں کو نہ میرے شاعری کرنے کا علم ہوا اور نہ ہی میری غزل کو ناقابلِ اشاعت قرار دینے والے اس خط کا علم ہو سکا۔ (چلو کچھ بھرم رہ گیا) اس غزل کا مقطع اب بھی مجھے یاد ہے۔

نہیں لطف حیدرؔ وہ ذکرِ خدا میں
جو ملتا ہے لطف ہم کو ذکرِ صنم میں

اس غزل کے مسترد ہونے کے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ میں نے پھر چھوٹی موٹی تک بندی کرتے رہنے کے باوجود ایک عرصہ تک کسی رسالے کو غزل بھیجنے کی جرات نہیں کی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے پھر اپنی کسی غزل میں ''صنم'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ ''سلگتے خواب'' کی ایک غزل میں ایک بار یہ لفظ از خود آ گیا تو میں نے اسے بھی حذف کر دیا۔

۱۹۶۸ء میں دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد میں نے حئی سنز شوگر ملز میں ملازمت کر لی۔ اسی دوران میں نے ایک چھوٹا سا ناول لکھا۔ یہ ناول اسکول کی ایک پتلی سی کاپی میں مکمل ہو گیا۔ ممکن ہے وہ طویل افسانہ ہو لیکن مجھے اس زمانہ میں ناول ہی لگا ہو۔ لیکن شاید وہ نہ تو ناول تھا نہ افسانہ۔۔۔وہ تو بس میرے اس وقت کے کچے پکے جذبات اور سماجی ناانصافیوں کے زخموں کی کسک کا اظہار تھا۔ نیم رومانی، اور نیم انقلابی قسم کی جیسے میری اپنی ہی کہانی تھی جو میں نے لکھی تھی۔ اس کہانی کی ایک ہی خوبی تھی کہ اس کا واحد قاری میں خود تھا اور قاری بھی ایسا کہ جو اسے مکمل کرتے ہوئے شدتِ جذبات سے آبدیدہ ہوتا رہا اور بعد میں

اسے پڑھتے ہوئے غم سے روتا رہا۔اس ناول کا ہیرو غریب تھا جو ظاہر ہے میں خود تھا اور ہیروئن امیر تھی اور امیر ہونے کے علاوہ بہت خوبصورت بھی تھی۔ویسے بیک وقت بہت خوبصورت اور بہت امیر ہیروئن مجھے ابھی تک کہیں نہیں ملی۔

شوگر ملز میں ملازمت کرنے کے بعد میری اپنے ایک ہمسایہ حفیظ سوز صاحب سے سلام دعا بڑھ گئی۔ ہمارے گھر کے ساتھ والی گلی میں یہ فیملی آباد تھی۔ حفیظ سوز صاحب فلمی دنیا میں جانے کا شوق رکھتے تھے۔خانپور کے ماحول میں اور میرے اس وقت کے ذہن کے مطابق وہ شاعری کو جتنا جانتے تھے میرے لئے کافی تھا۔کالونی مڈل اسکول خانپور کے سامنے محکمہ انہار کے دفاتر تھے۔وہاں کے کسی افسر کے ایک صاحبزادہ (اب نام یاد نہیں رہا) سے حفیظ سوز کی دوستی تھی۔چنانچہ ہم تینوں نے مل کر ''ایوان ادب'' نامی ایک ادبی انجمن قائم کی۔محکمہ انہار کے افسر کے صاحبزادے اس کے سرپرست،حفیظ سوز صدر،میں جنرل سیکریٹری،امین (مینو) خزانچی مقرر ہوئے۔تاہم اس ادبی انجمن کا کبھی کوئی اجلاس نہ ہو سکا۔حفیظ سوز نے بھی شوگر ملز میں ملازمت کر لی۔وہاں سے وہ لاہور چلے گئے اور اداکار قوی کے فلمی ادارہ سے منسلک ہو گئے۔لیکن کوئی اہم ترقی نہ کر سکے تو پھر ملتان میں کوئی ملازمت کر لی۔

یہ وہ دور تھا جب ابھی میں نے باقاعدہ ادبی دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا۔۱۹۷۱ء میں ، میں نے پہلی باقاعدہ غزل کہی۔یہ غزل بغیر کسی ردو بدل کے ۱۹۷۲ء کے کسی مہینے میں ہفت روزہ ''لاہور'' میں چھپ گئی۔بالکل روایتی انداز کی اس غزل کا مطلع یہ تھا ۔۔۔

عقل نے جتنا مِری راہ کو ہموار کیا

اتنا ہی میرے جنوں نے اسے دشوار کیا

اس غزل کے چھپنے کے بعد مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔چنانچہ پھر میں باقاعدہ غزلیں کہنے لگا۔ ۔۔۱۹۷۴ء میں بزمِ فرید خانپور کے ذریعے سے مجھے اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ پڑھنے کا موقعہ ملا اور ہفت روزہ مدینہ بھاولپور میں چھپنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسا کہ میں شروع میں ذکر کر چکا ہوں، میں نے اپنی سب سے پہلی بے تکی اور ناقابلِ اشاعت غزل میں لکھا تھا۔

نہیں لطف حیدؔر وہ ذکرِ خدا میں
جو ملتا ہے لطف ہم کو ذکرِ صنم میں

اب اپنے پورے ادبی سفر کو شاعری کے حوالے سے دیکھنے لگا ہوں تو مجھے اپنی تین نئی غزلوں کے مقطعوں میں جیسے اپنے ادبی سفر کی پوری روداد مل گئی ہے۔بس میں نے مذکورہ بالا شعر سے لے کر ان اشعار تک کا سفر کیا ہے۔

یا آنکھوں میں خاک برستی تھی حیدؔر
یا اب پیہم اشک دعا میں گرتے ہیں

بن جاتا تریاق اسی کا زہر اگر تم حیدؔر
کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اُس پر دَم کرتے

آنکھیں اُس کی بھی ہیں اب برسات بھری
حیدؔر مَیل دلوں کے دُھلنے والے ہیں

میری شاعری کی بات میری پہلی کے غزل کے مقطع سے شروع ہوئی تھی اور اب تک کی تازہ غزلوں کے مقطعوں تک آ پہنچی ہے۔گویا ''سخن گسترانہ'' بات مقطع سے شروع ہو کر مقطعوں میں آ پڑی ہے۔

میرے پہلے بے تکے اظہار سے لے کر ایسے اشعار تک۔۔۔۔یہی میرے اب تک کے شعری سفر کی رُوداد ہے۔فکری اور شعری لحاظ سے جتنا بھی سفر طے ہوا ہے سراسر خدا کا فضل اور احسان ہے۔وگرنہ من آنم کہ من دانم!

☆☆☆

(کھٹی میٹھی یادیں کا ایک باب ''ابتدائی ادبی زمانہ''۔بحوالہ ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'')

☆☆☆

دعائے دل

(بہ عنوان: ضروری وضاحت)

۱۹۹۱ء میں ''سلگتے خواب'' کی اشاعت کے بعد ۱۹۹۶ء میں میرے دو شعری مجموعے ''عمرِ گریزاں'' اور ''محبت کے پھول'' منظرِ عام پر آئے تھے۔ اور اب ۱۹۹۷ء میں نیا شعری مجموعہ ''دعائے دل'' شائع ہو رہا ہے۔ یکے بعد دیگرے یہ مجموعے آنے کا ایک پس منظر تھا۔

۱۹۹۰ء میں جب میں ''سلگتے خواب'' مرتب کرنے لگا تھا تب میری بیس نظمیں موجود تھیں۔ مگر میں چاہتا تھا کہ میرا پہلا مجموعہ صرف غزلوں پر مشتمل ہو۔ چنانچہ میں نے ۱۹۹۰ء تک کی اپنی شاعری میں سے ۲۰ نظموں کے ساتھ ایک آزاد غزل اور پانچ غزلیں بھی روک لیں۔ غزلیں روکنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ کتاب کی ضخامت ۱۴۴ صفحات تک رہے۔ ۱۹۹۰ء میں مرتب کردہ میرا شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' ۱۹۹۱ء میں شائع ہو گیا۔ ۱۹۹۳ء کے وسط تک میں مزید ۲۰ غزلیں اور پانچ نظمیں کہہ چکا تھا۔ اس دوران ۴۲ ماہیے بھی ہو چکے تھے۔ سو میں نے ۲۵ غزلوں، ایک آزاد غزل، ۲۵ نظموں اور ۴۲ ماہیوں کا مجموعہ ''عمرِ گریزاں'' مرتب کر کے اپنی ناشر کو بھیج دیا۔ یہ شعری مجموعہ ۱۹۹۳ء کے آخر یا ۱۹۹۴ء تک چھپنا تھا لیکن بد قسمتی سے ۱۹۹۶ء میں جا کر شائع ہوا۔ مزید قباحت یہ ہوئی کہ اس میں نہ صرف کتابت کی متعدد غلطیاں موجود تھیں بلکہ کئی مقامات پر اسے میرے اصل مسودہ سے بھی مختلف کر دیا گیا۔

سو یہ سمجھنا چاہیے کہ ''سلگتے خواب'' اور عمرِ گریزاں'' کی شاعری ۱۹۹۳ء تک کی میری کل شاعری ہے۔ ''محبت کے پھول'' میں ''عمرِ گریزاں'' کے ۴۲ ماہیوں سمیت ۲۰۰ ماہیے شامل ہیں۔ یہ باقی ماہیے میں نے ۱۹۹۳ء کے وسط سے لے کر ۱۹۹۷ء کے شروع تک کہے تھے۔

''دعائے دل'' کی شاعری ۱۹۹۳ء کے وسط سے لے کر ۱۹۹۶ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ یہ مختصر سا مجموعہ اتنی جلدی لانے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اسے

شائع کرانا ضروری ہو گیا۔

ا۔''عمرِ گریزاں'' کی کتابت کی اغلاط اور بے جا ترامیم کو دور کرکے اغلاط سے پاک نئے ایڈیشن کو لانے کی ضرورت تھی۔

۲۔ ''سلگتے خواب'' کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا۔اس کے نئے ایڈیشن کو لانے کی ضرورت تھی۔

۳۔۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۶ء تک میری شاعری کی عمر پورے پچیس سال بنتی ہے۔میں نے سوچا کہ پہلی دو کتابوں کے الگ الگ نئے ایڈیشن چھپوانے کی بجائے ۱۹۹۶ء تک کی شاعری''دعائے دل''کے نام سے چھپوا لوں اور پھر چاروں مجموعوں ''سلگتے خواب''،''عمرِ گریزاں''،''محبت کے پھول''اور''دعائے دل'' کی شاعری ایک ہی جلد میں لے آؤں۔

سو یوں اب جلد ہی اپنی پچیس سالہ شاعری کا مجموعہ''غزلیں،نظمیں،ماہیے''چھپوانا چاہتا ہوں۔

دعا کریں کہ ایسا کر سکوں!

حیدرقریشی

☆☆☆

عرضِ حال

(غزلیں،نظمیں،ماہیے)

''غزلیں،نظمیں،ماہیے''میری اب تک کی کل شاعری یعنی چار شعری مجموعوں کا مجموعہ ہے۔

اس جلد میں اپنے چاروں شعری مجموعوں کی ترتیب کوتھوڑا سا تبدیل کرکے پیش کر رہا ہوں۔یہ تبدیلی اتنی ہے کہ پہلے ساری غزلیں یک جا کر دی ہیں،پھرنظمیں ہیں اور پھر ماہیے۔

غزل نمبر ۱ تا ۷۸ وہی غزلیں ہیں جو''سلگتے خواب''میں شامل تھیں۔غزل نمبر ۷۹ تا۱۰۳ وہ غزلیں ہیں جو ''عمرِ گریزاں''میں شامل تھیں اور نمبر ۱۰۴ تا ۱۴۰ تک کی غزلیں''دعائے دل'' والی ہیں۔

نظموں کے حصہ میں پہلی ۲۵نظمیں''عمرِ گریزاں''سے اور باقی دونظمیں''دعائے دل''سے ہیں۔''عمرِ گریزاں''کے پہلے ایڈیشن میں ناشر کے اخلاص کے باوجود نہ صرف کتابت کی متعدد اغلاط راہ پا گئی تھیں بلکہ کئی مقامات پر اس مجموعے کو میرے اس فائنل مسودے سے بالکل مختلف کر دیا گیا تھا جو میں نے ناشر کو دیا تھا۔سو''عمرِ گریزاں''میں وہ ساری درستی کر دی ہے۔اسی طرح''سلگتے خواب''کے چند مصرعوں پر بھی نظرِثانی کی ہے۔

''محبت کے پھول''میرے ماہیوں کا مجموعہ تھا۔اس کے ماہیے اس کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔''محبت کے پھول'' میں بھی میں نے وضاحت کر دی تھی،یہاں بھی یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماہیوں کے مجموعہ میں شامل ۲۰۰ ماہیوں میں سے۴۲ ماہیے پہلے''عمرِ گریزاں''میں بھی چھپ چکے تھے۔

میری دانست میں میری غزل گوئی کے چار ادوار ہیں۔ابتدائی دور جب میں نے روایتی غزل کے انداز میں غزلیں کہیں۔اس دور کی غزلوں میں اس طرز کی غزلیں شامل ہیں:

دھند یادوں میں جیسے بھٹکتے رہے

وہ بھی تکتے رہے،ہم بھی تکتے رہے

ہم جو میدانِ عمل میں ڈٹ گئے
راستے سارے سفر کے کٹ گئے

لے نہ ڈوبے خواہشوں کا یہ تلاطم دیکھنا
ہو نہ جانا خود بھی اس طوفان میں گم دیکھنا

دوسرا دورانتہا پسند جدیدیت کے زیرِ اثر تھا۔تب میں نے جدیدیت کی چکا چوند میں اس ٹائپ کی غزلیں کہیں:

جب آئے موسموں کی زد میں ساونوں کے بدن
ہوا میں بھیگ گئے ننگی بارشوں کے بدن

رستے چلے گئے ہیں خرابوں کی جھیل میں
ہم تشنہ لب ہی رہ گئے خوابوں کی جھیل میں

وہ پچھلی گھڑی شب کی،وہ خوف زدہ چہرہ
سو پایا نہ اک پل بھی خوابوں سے ڈرا چہرہ

تیسرا دورانتہا پسند جدیدیت کے اثر سے نکلنے کا دور تھا۔اس عرصہ کی غزلوں کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے میری غزل کے اس انداز کومعروضی رویے کے طور پر دیکھتے ہوئے لکھا تھا:

''حیدرقریشی کے ہاں اس کے نتیجے میں ایک ایسی موہوم سی مسکراہٹ ابھری ہے جس میں شرارت کا عنصر واضح طور پر شامل ہے''

میری غزل گوئی کا چوتھا دور دراصل سابقہ تینوں ادوار کے مثبت اثرات سے مل کر

بنا ہے۔اب شاید میں نے تھوڑا بہت غزل کہنا سیکھ لیا ہے اور مزید سیکھنے کی طرف گامزن ہوں۔

نظم نگاری میں نے اس دور میں شروع کی جب میں انتہا پسند جدیدیت کے حصار سے باہر آرہا تھا۔میری گنتی کی چند نظموں میں بھی دو انداز واضح ہیں۔ماہیا نگاری کے سلسلے میں مجھے خوشی ہے کہ اردو ماہیے کو پنجابی ماہیے کے وزن اور مزاج کے مطابق کرنے میں مجھے بنیادی نوعیت کا کام کرنے کا موقعہ ملا۔میں نے پنجابی ماہیے کے وزن اور مزاج کوملحوظ رکھتے ہوئے اردو میں ماہیے ہیں اوراس میں موضوعاتی لحاظ سے کچھ نئے تجربے بھی کیے ہیں۔

میں ''سلگتے خواب''اور''عمرِ گریزاں''کے(بالخصوص''عمرِ گریزاں'' کا تصحیح شدہ)ایڈیشن ثانی چھپوانا چاہتا تھا۔اسی دوران خیال آیا کہ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۹۶ء میں نے اپنی شعری زندگی کے پچیس سال پورے کر لیے ہیں ،تو کیوں نہ پچیس برسوں کی شاعری ایک جلد میں لا کے اپنی سلور جوبلی منا لوں۔

اگر قارئین کو میری یہ''غزلیں،نظمیں،ماہیے'' یاان کا کوئی حصہ اچھا لگا تو میں یہ سمجھ کرخوش ہولوں گا کہ اپنی پسندیدگی کے احساس کے ساتھ وہ بھی میری سلور جوبلی کی خوشی میں شریک ہو گئے ہیں۔

حیدرقریشی(جرمنی)



عرضِ حال

(قفس کے اندر)

گزشتہ چند برسوں سے میری زیادہ تر کتابیں دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے مصطفیٰ کمال پاشا صاحب کتاب کو پروفیشنل انداز سے شائع بھی کرتے تھے اور اس کی ترسیل بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کرتے تھے۔میری شعرو نثر کی گیارہ کتابوں کا مجموعہ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کا عوامی ایڈیشن بھی دہلی سے شائع ہوا اور لائبریری ایڈیشن بھی وہیں سے شائع ہوا۔دلی خواہش تھی کہ پاکستان سے بھی ان کتابوں کی اشاعت کی کوئی صورت نکل سکے۔لائبریری ایڈیشن طرز کی اشاعت کے لیے تو کسی بڑے اور پروفیشنل پبلشر کی راہ دیکھ رہا ہوں۔تاہم ارشد خالد اور سعید شباب دونوں دوستوں کی مہربانی سے اب پاکستان سے کتابوں کے عوامی ایڈیشنز کی اشاعت کی ایک صورت بنتی دکھائی دے رہی ہے۔دونوں دوست مل کر میری کتابوں کے عوامی ایڈیشن شائع کریں گے۔اس سلسلہ میں ایک تو میری یادوں کے مجموعہ''کھٹی میٹھی یادیں'' کو شائع کیا جا رہا ہے۔دوسرا شاعری کا یہ ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے جو بجائے خود ایک تجربہ بھی ہے۔

پہلے پانچ شعری مجموعوں کے بعد کی شاعری میں اب تک ۲۷ غزلیں،تین نظمیں اور تھوڑے ماہیے ہوئے تھے۔ان سب کو **''زندگی''** کے نام سے نئے شعری مجموعہ کا حصہ بنا رہا ہوں۔اور اسی ترتیب سے اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔

چھ شعری مجموعوں پر مشتمل **قفس کے اندر** کے نام سے ترتیب دیئے گئے اس مجموعہ میں شامل شاعری کو اگر شعری مجموعوں کے رائج شدہ انداز میں شائع کیا جائے تو اس کی ضخامت چھ سو صفحات سے بڑھ جائے گی۔ایسی اشاعت کسی پروفیشنل پبلشر کے توسط سے کبھی

بھی ممکن ہے۔لیکن فی الوقت ادب کے عام قاری اور خاص طور پر نئی نسل کے قارئین کے لیے یہ عوامی طرز کا اکانومی ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔چھ سو سے زائد صفحات کی شاعری کو صرف ایک سو باون صفحات کے اندر یک جا کر لینا بچت کی ایک صورت بھی ہے۔

دیکھتے ہیں کتنے قارئین تک پہنچ پاتا ہوں!

حیدر قریشی

☆☆☆

شاعری کے حوالے سے

مختلف انٹرویوز سے اقتباسات

حیدر قریشی سے انٹرویو: ڈاکٹر صابر آفاقی

سوال: جرمنی میں آنے کے بعد آپ کی غزل میں کس قدر تبدیلی آئی ہے؟

جواب: ایک دوست نے مجھے لکھا کہ جرمنی جانے کے بعد آپ کی غزل میں اظہار بہت زیادہ کھلا ڈُلا ہو گیا ہے۔ بات ان کی درست تھی۔ ہجر کے لمبے زمانے کے بعد وصل کا موسم آئے تو اس کا اثر تو ظاہر ہوگا۔ لیکن یہ بھی ہے کہ میری ابتدائی غزلوں میں بھی ایسے اشعار موجود تھے:

یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے
تمہارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے

رات بھر وصل کا چاند چمکا کیا
دل سمندر ہمکتے رہے رات بھر

تمہارے ہی لئے ہیں دل کے جتنے مل سکیں ٹکڑے
تمہارے واسطے ہے تن پہ جتنا ماس باقی ہے

اور یہاں جرمنی میں آنے کے بعد میری غزل میں ایسے اشعار بھی ہوئے ہیں:

یہ آنکھ کے آنسو ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے
قابو میں نہیں دل کہ حضوری کی گھڑی ہے

آج تو کھل کے ہنس دیئے حیدؔر
دل کے زخموں کے جتنے ٹانکے تھے

جب اس نے خاک اڑانے کا ارادہ کر لیا ہے
تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کر لیا ہے

جرمن احسانات سبھی برحق حیدؔر
فیض مگر کچھ اور ہی دھرتی ماں کے تھے

آج حیدؔرمُوڈ ہی کچھ اور تھا
سو غزل میں استخارہ کر لیا

اس کے باوجود بہر حال یورپ کے ماحول کی کشادگی کا اثر تو غزل پر آنا تھا سو آیا، لیکن صرف غزل پر ہی کیوں؟ اس کے اثرات تو میری ساری تخلیقات میں ہوں گے۔

(سہ ماہی ادبِ عالیہ وہاڑی۔ پاکستان شمارہ اپریل تا جون۲۰۰۲ء)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

سلطانہ مہر کے بیس سوالوں کے جواب

سوال نمبر ۷: شعر گوئی کے لیے کونسی کیفیت یا جذبہ آپ کے لیے سب سے بڑا محرک ہوتا ہے؟

جواب: عام سے دکھ یا نارمل سی خوشی سے بڑھ کر کوئی بھی دکھ یا خوشی کی

کیفیت مجھے اس طرف مائل کر دیتی ہے تاہم اس کے لئے مجھے ہمیشہ اپنے اندر کی آواز کا انتظار رہتا ہے۔مناظر و مظاہر فطرت سے میں بیگانہ نہیں رہ سکتا اسی لئے دیہاتی ماحول کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔آپ مجھے " پینڈو ادیب " کہیں تو مجھے شرمندگی نہیں ہو گی خوشی ہو گی۔ محبت کا جذبہ میرے لیے لکھنے کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔لیکن یہ عام سطحی محبت کی بات نہیں ہے ۔اسے سمجھنے کے لئے میرے خاکوں کے مجموعہ " میری محبتیں " کو میرے دونوں شعری مجموعوں " سلگتے خواب " اور " عمر گریزاں " کے ساتھ ملا کر پڑھیئے۔

سوال نمبر ۸ :کس مکتبہء فکر سے آپ کی شاعری متاثر ہے، کیا ادب اور شاعری کو نظریاتی ہونا چاہیے؟ آپ کس نظریے کے تحت شعر کہتے ہیں؟

جواب : میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کسی بھی نظریے کے تحت شعر نہیں کہتا اور نہ ہی ایسی شاعری کو اچھی شاعری سمجھتا ہوں جو پہلے نظریے کی پابندی کرائے اور پھر اس کے مطابق شاعری کرائے ۔ ہر شاعر زندگی کے مختلف نظریات میں سے کسی نہ کسی کا معترف ضرور ہوتا ہے سو اس کا نظریہ اس کی روح کا جُز و بن کر جب اس کے اندر سے آتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے لیکن جب محض کسی عقیدے کا اظہار مقصود ہو اور شاعری ثانوی حیثیت اختیار کر جائے تب پراپیگنڈا شاعری تو وجود میں آجاتی ہے اچھی شاعری نہیں ۔آپ اردو ادب میں ہندو مسلم اور سکھ ادیبوں کے بڑے نام دیکھ لیں مختلف عقائد اور نظریات کے باوجود ان سب نے بڑا ادب تخلیق کیا ہے کوئی ادیب کسی بھی نظریہ کو ماننے والا ہو، لمحہء تخلیق میں وہ اپنے باہر سے آزاد ہو کر اپنے اندر کی آواز پر لکھتا ہے تو اس کے اندر کے نظریے سے اپنے اختلاف کے باوجود میں اسے بڑا ادیب سمجھوں گا۔ میں نے جتنے مختلف قسم کے ادبی نظریات کو پڑھا ہے ان کے کچھ نہ کچھ اثرات تو ضرور مرتسم ہوئے ہیں میں نے ایک مزدور اور محنت کش کی زندگی گزاری ہے اس کے اثرات بھی ہیں ۔روحانیت سے مجھے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے سو تصوف کے اثرات بھی ہیں لیکن میرے نزدیک بنیادی اہمیت اندر کی آواز کو حاصل ہے۔

(کتاب ''سخن ور'' مرتب کردہ سلطانہ مہر۔۔۔اور کتاب ''انٹرویوز'' مرتب کردہ سعید شباب)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی سے ایک مکالمہ از ڈاکٹر وسیم انجم

وسیم انجم : آپ کی شاعری کو 25 سال مکمل ہو چکے ہیں اور پچیس سالہ شاعری پر کلیات بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔ شاعری کے اس دور کو آپ کتنے حصوں میں منقسم کریں گے۔ اور اس دوران اپنے نشیب و فراز پر روشنی ڈالئے۔

حیدر قریشی : میں نے اپنے اندر کے نقاد کی مدد سے اپنی شاعری کو چار ادوار میں بانٹ کر دیکھا ہے۔ اور اس کا ذکر اپنی کتاب "غزلیں، نظمیں، ماہیے" میں کیا ہے۔

۱۔ روایتی غزل کا دور۔

۲۔ انتہا پسند جدیدیت کے زیر اثر غزل کہنے کا دور۔

۳۔ انتہا پسند جدیدیت کے اثر سے نکلنے کا دور۔

۴۔ اور سابقہ تینوں ادوار کے مثبت اثرات سے مل کر بنا دور

جہاں تک نشیب و فراز پر روشنی ڈالنے کا تعلق ہے تو یہ کام تو قاری اور ناقد کو کرنا ہے۔

وسیم انجم : آپ نے آزاد نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔ آپ کے نزدیک آزاد نظم اور نثری نظم کے مستقبل میں کیا امکانات ہیں؟ ان کی زندگی کا انحصار کن وجوہات پر ہے؟ ان دونوں کے فرق اور باہمی تعلق پر کچھ بتلایئے۔

حیدر قریشی : آزاد نظم شاعری ہے۔ لیکن نثری نظم شاعری نہیں ہے۔ اس میں شعری مواد تو ہوتا ہے۔ لیکن شاعری نہیں بن پاتا۔ ایک خوبصورت عمارت کو اگر نظم مان لیں تو اس عمارت میں استعمال ہونے والے سارے میٹریل کا ڈھیر نثری نظم ہے۔ جب تک یہ میٹریل فن تعمیر میں صرف ہو کر اپنے وجود کا اظہار نہیں کرے گا۔ تب تک صرف شعری مواد رہے گا۔ شاعری نہیں بن پائے گا۔ مغرب میں بے جا آزادی کے معاشرتی رجحان نے نثری نظم جیسی اصناف کو ادب کی سطح پر قبول کیا ہے۔ لیکن ہم مغرب کی اندھی تقلید تو نہیں کر سکتے۔ ایک حد تک ہی ان کے فیوض سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ مغرب میں شادی کے بغیر بچہ پیدا کر

لینا عیب نہیں ہے۔لیکن ہمارا معاشرہ اس "خوبی" کو قبول نہیں کر سکتا۔

(بحوالہ کتاب ''حیدر قریشی فکر وفن،مصنف و مرتب ڈاکٹر وسیم انجم۔ مطبوعہ راولپنڈی۔سال ۱۹۹۹ء)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

انٹرنیٹ کے ذریعے مکالمہ:ڈاکٹر نذر خلیق

نذر خلیق: میں کوشش کروں گا کہ انٹرویو کے روایتی سوالوں سے بچ کر ایسے سوال کر سکوں جن سے آپ کے فن کی مختلف جہتوں کو سمجھنے میں آپ کے جوابوں سے کچھ مدد مل سکے۔تو میں آپ کی شاعری سے بات شروع کرتا ہوں۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے شاعری کے حوالے سے تمام امکانات کو پا لیا ہے اور آپ کی شاعری کے بارے میں جو کام ہوا ہے یا جو رائے دی جا رہی ہے مکمل اور جامع ہے؟

حیدر قریشی :ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں کہوں میں اپنی شاعری کے سارے امکانات کو پا چکا ہوں۔ہاں کچھ عرصہ سے شاعری کی روانی قائم نہیں رہی۔لیکن یہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔میرا پہلا شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' شاعری شروع کرنے سے ۲۰ سال کے بعد شائع ہوا۔اور چوتھا شعری مجموعہ ''دعائے دل'' چار سال کے عرصہ میں مکمل ہو گیا،جبکہ اس کی زیادہ تر شاعری ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء کے دو برسوں کی ہے۔اب پانچ مجموعوں کی کلیات مکمل کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ شاعری میں کچھ ٹھہراؤ سا آ گیا ہے۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ سب عارضی وقفے ہوتے ہیں۔ویسے ممکن ہے میری نثر کی طرف اور انٹرنیٹ کی طرف توجہ زیادہ دینے کی وجہ سے شاعری نظر انداز ہو رہی ہو۔باقی میری شاعری پر جتنا کام ہوا ہے،ہر جائزہ لینے والے کے اپنے مزاج کی بات ہے۔ممکن ہے کچھ اور لکھنے والے کسی اور زاویے سے بھی جائزہ لے سکیں۔

نذر خلیق: آپ غزل،نظم اور ماہیے میں سے کسے ترجیح دیں گے،کسے زیادہ اہم کہیں گے؟

حیدر قریشی: دراصل شاعری ہو یا دوسری نثری اصناف ہوں یہ سب اظہار کے مختلف پیمانے ہیں اور میں جب کوئی تخلیقی اظہار کرتا ہوں تو اس کی نوعیت کے مطابق اس کا پیمانہ از خود اسی فارم کی صورت میں آ جاتا ہے۔اس لئے کسی کو بھی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔البتہ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اب پھر کہہ رہا ہوں کہ شاعری میری پہلی محبت ہے۔اس میں غزل اظہار کا پہلا پیمانہ تھا۔اس کے باوجود کسی صنف کو کسی دوسری پر ترجیح دینا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

نذر خلیق: میں ابھی صرف شاعری تک محدود رہ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔آپ نے شاعری کے لئے صرف ان تین اصناف کو ہی چنا ہے۔متعدد دوسری نئی اور پرانی اصناف میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اس کی کیا وجہ ہے؟

حیدر قریشی: آپ پہلے سوال کو پھر گھما لائے ہیں۔میں نے جن اصناف میں اظہار کیا ہے وہی میرے مزاج سے مطابقت رکھتی تھیں۔باقی اصناف شاید میرے مزاج اور میرے تخلیقی تجربے سے میل نہ کھاتی ہوں گی۔کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے کسی دوست کا خط آیا میں فلاں صنف کا ایک انتخاب ترتیب دے رہا ہوں۔آپ فوری طور پر اتنی رباعیات،یا اتنی کہہ مکرنیاں،یا کچھ اور بھیج دیں۔ان سارے دوستوں کی پر خلوص پیش کش کے جواب میں ہمیشہ میں نے معذرت کی ہے۔اگر کبھی اندر سے لہر اٹھے تو ہوسکتا ہے میں وہ شاعری بھی کر لوں جس کی مجھ سے فرمائش کی گئی تھی۔لیکن اگر اندر سے لہر نہیں اٹھتی تو محض چھپنے کے لئے یا کسی انتخاب میں شامل ہونے کے لئے ایسی فرمائشی شاعری کرنا میرے لئے مشکل ہے۔

نذر خلیق: اپنی غزلوں کے معیار کے سلسلے میں آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

حیدر قریشی: اگر چہ اپنے اظہار کے لئے میں اس حد تک مطمئن ہوں کہ جو کہنا چاہتا ہوں کسی نہ کسی رنگ میں کہہ لیتا ہوں،تاہم مجھے کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ طبیعت کی موزونیت کے باوجود مجھے کوئی اچھا رہنما مل جاتا تو عروض کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ میرے

لئے مفید ثابت ہوتی۔ مجھے کبھی کبھی اپنی اس کمی کا احساس ہوتا ہے۔

نذر خلیق: لیکن ماہیے کے اوزان کے سلسلے میں تو آپ نے خاصی عروضی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

حیدر قریشی: نہیں یار۔۔وہ تو ماہیے کی لے کو برقرار رکھنے کے لئے مجبوراً تھوڑی شد بد حاصل کرنا پڑی۔اس میں بھی میں نے لے کو بنیاد مان کر اس کی رینج میں آنے والے سارے معین اوزان اور مختلف اوزان کو یکجا کیا ہے۔ بلکہ اس عمل کے دوران عروضی میدان میں اپنی کم علمی کا احساس اور بڑھ گیا ہے۔البتہ جب میں کئی اپنے جیسے عروض سے نابلد لوگوں کو بڑے ناز کے ساتھ ماہرِ عروض کے طور پر بولتے اور لکھتے دیکھتا ہوں تو ان کی بہادری پر حیرت بھی ہوتی ہے اور شرمندگی بھی۔

نذر خلیق: آپ کی ذاتی زندگی کا عکس آپ کی شاعری میں بہت دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر شفیق احمد صاحب نے تو اس وجہ سے اپنے مضمون میں اس کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے۔

حیدر قریشی: شاعری کا ایک دور وہ تھا جب میں شعری روایات کے زیرِ اثر بیت برائے بیت کہہ رہا تھا۔لیکن یہ میری شاعری کا عبوری دور تھا جسے میں نے جلد عبور کر لیا۔اس کے بعد میری شاعری میرے گہرے مشاہدے یا ذاتی تجربات کا پرتو ہے۔اسی لئے اس میں میری ذاتی زندگی موجود ہے۔میری زندگی میں موجود لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔

نذر خلیق: کیا اس لحاظ سے آپ ترقی پسندوں اور حقیقت پسندوں کے قریب نہیں آ جاتے جو شاعری اور ادب کو زندگی کا عکاس قرار دیتے ہیں؟

حیدر قریشی: شعر و ادب محض زندگی کے عکاس نہیں ہیں۔اس سے سوا بھی بہت کچھ ہیں ۔تاہم جہاں تک ترقی پسندی کی اس روایت کا تعلق ہے کہ یہ زندگی کی بات کرتی ہے تو یقیناً میری شاعری اس لحاظ سے ترقی پسند روایت سے قریب ہے۔

نذر خلیق: لیکن آپ ڈاکٹر وزیر آغا کے زیرِ اثر ترقی پسندوں سے خاصے دور ہیں؟

حیدر قریشی: مزیدار سوال ہے۔دراصل میری ذاتی زندگی ایک مزدور کی زندگی ہے جس کی ترجمانی ترقی پسند کرتے ہیں۔ظاہر ہے میں ترقی پسندی کے اس سارے عمل سے پوری زندگی گزرا ہوں۔استحصالی قوتوں سے ہر قدم پرلڑائی لڑی ہے۔اگر میں ادبی سطح پر ترقی پسند حلقے میں شامل ہوتا تو اس کے نتیجہ میں میرے ہاں بلند آہنگ نعرہ بازی کی حد تک آجاتا۔اس لحاظ سے وزیر آغا کی فکر میرے لئے بہت بابرکت ثابت ہوئی کہ میں عملی زندگی میں ترقی پسند ہوکر خارجی محاذ پرلڑتا رہا اور ادبی طور پر میں نے خارج کے بجائے اپنے داخل پر توجہ مرکوز کی۔یوں میرے ہاں داخلیت اور خارجیت کا ایک توازن فطری طور پر آ گیا۔

نذر خلیق: لیکن داخلیت کی اہمیت کو ماننے والے تو ایک قدم آگے بڑھ کر باہر کو بھی اندر کا ہی ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔

حیدر قریشی: بھائی! یہ تو ادبی مباحث ہیں چلتے رہتے ہیں۔ہر علمی نکتہ میں کوئی نہ کوئی مفید یا مزے کی بات ہوتی ہے۔میں سلطان باہو کو پڑھ رہا تھا۔جب ان کے اس مصرعہ پر پہنچا۔ ظاہر باطن عین ایانی ہُو ہُو پیا سینوے ہُو۔۔۔۔تو مجھے لگا کہ داخل اور خارج کی بحث اپنی علمی اہمیت کے باوجود تخلیق کی اعلیٰ اور صوفیانہ سطح پر جا کر بے معنی ہو جاتی ہے۔لیکن ایسا صرف صوفیانہ تجربے جیسے تخلیقی لمحہ میں ہوتا ہے۔اس کے بعد پھر وہی مباحث ہیں اور ان پر سب کے اپنے اپنے دلائل ہیں۔اور ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(مطبوعہ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' عوامی ایڈیشن
۔زیر اہتمام معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔۲۰۰۵ء)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

عبدالرب استاد کے سوال اور حیدر قریشی کے جواب

سوال: آپ کی پہلی شعری تخلیق کونسی تھی؟ اور کہاں شائع ہوئی؟

جواب: میری پہلی تخلیق ایک غزل تھی،۱۹۷۱ء میں یہ غزل کہی تھی۔ے

عقل نے جتنا مری راہ کو ہموار کیا

اتنا ہی میرے جنوں نے اسے دشوار کیا

یہ غزل ثاقب زیروی کے رسالہ ویکلی لاہور میں۱۹۷۲ء کے وسط کے کسی شمارہ میں چھپی تھی۔تاہم میرے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔سعید شباب کی مرتب کردہ کتاب'' انٹرویوز'' کے صفحہ۲۷ پر اس کا ذکر موجود ہے۔''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' کے صفحہ نمبر۲۰۳ اور ۲۰۴ پر بھی اس کی تفصیل درج ہے۔

(مطبوعہ سہ ماہی ''خرمن''بورے والا شمارہ:۱)

....

حیدر قریشی سے انٹرویو:محمد عاصم بٹ

محمد عاصم بٹ : آپ کیوں لکھتے ہیں؟

حیــدر قــریشی :ابتدائی ایام میں یہ سوال پوچھا جاتا تو شاید اس کا کچھ کچا پکا جواب سوجھ جاتا۔اب جو جاننے کی کسی معمولی سی سطح تک آیا ہوں تو مجھے خود معلوم نہیں ہو پارہا کہ میں کیوں لکھتا ہوں۔لیکن یہ حقیقت ہے اب لکھنا، پڑھنا میرے جینے کا ایک بہانہ ہے۔

محمد عاصم بٹ :لکھنا آپ کے لیے آسان ہے،خوشگوار یا تکلیف دہ؟

حیــدر قریشی :جیسا ابھی عرض کیا ہے کہ زندگی بسر کرنا اور لکھنا میرے لیے

ایک جیسا ہے تو جیسے زندگی میں خوشگوار اور تکلیف دہ کیفیات آتی رہتی ہیں، ویسا ہی لکھنے کے عمل کے دوران بھی مختلف کیفیات بنتی، بدلتی رہتی ہیں۔البتہ زندگی بھر لکھنے کے عمل سے گزرنے کے بعد اب جب بھی لکھنے کا موڈ بن جائے تو لکھنا مشکل نہیں رہتا۔ بلکہ موڈ بن جانے کی وجہ سے ایسی روانی آجاتی ہے کہ لکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

محمد عاصم بٹ : لکھنے کی تحریک کیسے ملتی ہے؟

حیــدر قریشی :غم یا خوشی کی کوئی بھی غیر معمولی کیفیت لکھنے کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ بہت اچھا ادب پڑھنے سے بھی غور وفکر کی تحریک ملتی ہے جو بالآخر خود بھی کچھ لکھنے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ فارمولا نہیں ہے لیکن ایسا بھی ہوا ہے۔

(مطبوعہ انٹرویوز مرتب کردہ سعید شباب۔انٹرنیٹ ایڈیشن)

☆☆☆

شاعری کا انتخاب

غزلیں

عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں
سسکتی پیاس لبوں پر فرات آنکھوں میں
پھر اس کو دامنِ دِل میں کہاں کہاں رکھیں
سمیٹ سکتے ہیں جو کائنات آنکھوں میں
تمہیں تو گردشِ دوراں نے روند ڈالا ہے
رہی نہ کوئی بھی پہلی سی بات آنکھوں میں
قطار وار ستاروں کی جگمگاہٹ سے
سجا کے لائے ہیں غم کی برات آنکھوں میں
وہ بے وفا کبھی اتنا بھی کب تھا بے گانہ
نہ بے رُخی، نہ کوئی التفات آنکھوں میں
بکھر گئے ہیں مِلن کے تمام دن حیدؔر
ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں

☆☆☆

مِرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں، کس رُت میں کیسے خواب لگے
نہ پُورا سوچ سکوں، چھوسکوں، نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند، کبھی گُل، کبھی کتاب لگے

نہیں ملا تھا تو برسوں گزر گئے یوں ہی
پر اب تو اس کے بِنا ہر گھڑی عذاب لگے
تمہارے ملنے کا مل کر بھی کب یقیں آیا
یہ سلسلہ ہی محبت کا اک سراب لگے
یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے
تمہارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے
ہمیں تو اچھا ہی لگتا رہے گا وہ حیدؔر
بلا سے ہم اُسے اچھے لگے، خراب لگے

☆☆☆

اِس طرح شہرِ اَنا پر میں تباہی مانگوں
اپنے ''ہونے'' سے ''نہ ہونے'' کی گواہی مانگوں
اُس کے ہونٹوں پہ میں پھر مہکوں تمنا بن کر
پھر وہ چاہت جو کبھی اُس نے تھی چاہی مانگوں
یہ تو ہوگا کہ میں بھڑکوں گا یا بجھ جاؤں گا
یوں سلگنے سے تو بہتر ہے ہوا ہی مانگوں
اُس کو پانے کی تمنا پہ یقیں کب ہے، مگر
ہاتھ جب اُٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگوں
اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدؔر
اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں

☆☆☆

کارِ جہاں بھی، عشق بھی کرنا نہ آسکا
جینے کا ڈھنگ کیا ہمیں مرنا نہ آسکا
تیری لگن میں تجھ سے بھی آگے نکل گئے

تیرے مسافروں کو ٹھہرنا نہ آسکا
ہم ایسے سخت جان تھے جو ٹوٹتے نہ تھے
کچھ ٹوٹ بھی گئے تو بکھرنا نہ آسکا
بس مسکرا کے پیار سے انکار کرگئے
اچھی طرح سے اُن کو مکرنا نہ آسکا
حیدرؔ ہم ان کے دل سے اُتر آئے خود مگر
اُن کو ہمارے دل سے اُترنا نہ آسکا

☆☆☆

آپ لوگوں کے کہے پر ہی اُکھڑ جاتے ہیں
لوگ تو جھوٹ بھی سو طرح کے گھڑ جاتے ہیں
آنکھ کس طرح کھلے میری کہ میں جانتا ہوں
آنکھ کھلتے ہی سبھی خواب اُجڑ جاتے ہیں
غم تمہارا نہیں جاناں ہمیں دُکھ اپنا ہے
تم بچھڑتے ہو تو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں
لوگ کہتے ہیں کہ تقدیر اَٹل ہوتی ہے
ہم نے دیکھا ہے مقدر بھی بگڑ جاتے ہیں
وہ جو حیدرؔ مِرے منکر تھے مِرے ذکر پہ اب
چونک اُٹھتے ہیں کسی سوچ میں پڑ جاتے ہیں

☆☆☆

اب تو جذبے زبان مانگتے ہیں
پَر بَریدہ اُڑان مانگتے ہیں
عشق کی پڑھنا چاہتے ہیں نماز
اور اِذنِ اذان مانگتے ہیں

دور سے صرف دیکھتے ہی رہیں
کب یہ ہفت آسمان مانگتے ہیں
ہم تہی دست آبروئے فقر
سود دے کر زیان مانگتے ہیں
دل کی اک بات کہنا ہے لیکن
پہلے جاں کی امان مانگتے ہیں
یا تو کچھ بھی نہیں ہیں مانگتے، یا
تیرے سارے جہان مانگتے ہیں
ایسی عمروں کے پیار تو حیدرؔ
جسم و جاں سے لگان مانگتے ہیں

☆☆☆

ہر چند ہم ایسے بھی جہاں تاب نہیں تھے
کب ماتھے پہ روشن کبھی مہتاب نہیں تھے
بے نام اُداسی تو ہمیشہ رہی لیکن
ہم اُس سے بچھڑ کر کبھی بے تاب نہیں تھے
یہ خواب بھی تیرے تھے اِنہیں ساتھ ہی لے جا
یہ بجھتے ہوئے خواب مِرے خواب نہیں تھے
کردارِ فقیہاں مِری آزادہ روی بھی
''گمراہی'' کے لیکن یہی اسباب نہیں تھے
اُس بزم میں ہر جھوٹ پہ بول اٹھتے تھے فوراً
نادان تھے ہم واقفِ آداب نہیں تھے
ہر گوہرِ نایاب کی تذلیل بجا ہے
پر ہم تو کوئی گوہرِ نایاب نہیں تھے

احباب کے تیروں کے تو ہم عادی تھے حیدؔر
اِس بار مگر بھائی تھے احباب نہیں تھے

☆☆☆

کون دیکھے گا بھلا میرے خدا میرے بعد
رنگ لائے گی اگر میری دعا میرے بعد
رُوبرو میرے بنا بیٹھا تھا پتھر کی طرح
کسی چشمے کی طرح پھُوٹ بہا میرے بعد
عشق کے قصے سبھی مجھ پہ ہوئے آ کے تمام
کوئی مجنوں، کوئی رانجھا نہ ہوا میرے بعد
اس میں مل جائے گا جا کر مِرے اندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد
جس نے دشمن کو مِرے قتل پہ اُکسایا ہے
لینا چاہے گا وہی خون بہا میرے بعد
ابھی ممکن ہی نہیں قرض چکانا تیرا
زندگی! قرض ترا ہوگا اَدا میرے بعد
روز طوفان اُٹھانے کی مشقت تھی اسے
دشت بے چارے کو آرام ملا میرے بعد
میرؔو غالبؔ کی عطا اُن کی زمیں میں یہ غزل
حیدؔر اوروں پہ بھی ہوگی یہ عطا میرے بعد

☆☆☆

گرچہ ہمیں ہے پہلے بھی اک زک لگی ہوئی
لیکن گئی نہ یاس سے چشمک لگی ہوئی
ہر آن ہے گمان کہ شاید وہ آگئے

دھڑکن ہے دل کی یا کوئی دستک لگی ہوئی
اپنا تمام حصہ اُنہیں دے کے آ گیا
آخر کو ختم کرنی تھی جھک جھک لگی ہوئی
تم اہلِ علم وفضل ہو لیکن کچھ اِس طرح
جیسے کوئی کتاب ہو دیمک لگی ہوئی
اُس کی محبتیں ہیں کسی اور کے لئے
تہمت ہمارے سر پہ ہے بے شک لگی ہوئی
پڑتا ہے یوں تو حُسن پہ اِس کا اثر مگر
اچھی لگی ہے آپ کو عینک لگی ہوئی
حیدرؔ مذاق مت اِسے سمجھو یہ عشق ہے
بازی ہے اِس میں پاؤں سے سر تک لگی ہوئی

☆☆☆

درد اندر کے سب آنکھوں میں اُبھر آئے تھے
عشق میں جب ہمیں پانی کے سفر آئے تھے
شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر
جب ترے شہر سے یہ شہربدر آئے تھے
آپ نے ہی درِ دل وا نہ کیا تھا ورنہ
صبح کے بھولے تو دوپہر کو گھر آئے تھے
یہ الگ بات کہ جی اُٹھے دوبارہ لیکن
ہم تری راہ میں تو جاں سے گزر آئے تھے
بازگشت اپنی ہی آواز کی بننا تھا ہمیں
ہم نے کب لَوٹ کے آنا تھا مگر آئے تھے
ایک سوہنی کی پذیرائی کی خاطر حیدرؔ

دل کے دریا میں کبھی کتنے بھنور آئے تھے

☆☆☆

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے
اب نکلتا ہی نہیں رُوح کی گہرائی سے
اہلِ دنیا بھلا اِس رَمز کو کیسے سمجھیں
عشق رُسوا نہیں ہوتا کبھی رُسوائی سے
متن میں آپ کا ہی ذکر چلا آتا ہے
اچھا ہے بچ کے رہیں حاشیہ آرائی سے
آخری مرحلہ اِس کھیل کا رہتا ہے ابھی
خوش نہ ہو لشکرِ اعداء مِری پسپائی سے
جو رہِ اہلِ ملامت پہ چلا جاتا ہو
مت الجھنا کبھی ایسے کسی سودائی سے
جسم بھی اپنی جگہ زندہ حقیقت ہیں مگر
دل نہیں ملتے فقط جسموں کی یکجائی سے
مرحلے آئے تھے خوف اور گنہ کے پہلے
روشنی گیان کی پھر پھُوٹی تھی تنہائی سے
بے لحاظی کا کسے دُکھ نہیں ہوتا حیدرؔ
ہم نے شکوہ نہ کیا پر کسی ہرجائی سے

☆☆☆

عشق میں اپنی ہی جب خاک اُڑالی ہم نے
پھر وہی خاک ترے پیار پہ ڈالی ہم نے
ڈھنگ کا کام کوئی ہم سے کبھی ہو نہ سکا
یوں تو سرسوں بھی ہتھیلی پہ جَما لی ہم نے

خود بھی پہچان نہیں پاتے ہیں اپنی صورت
جانے کس روگ میں یہ شکل بنا لی ہم نے
وہ بھی انکار کا عادی نہ رہا تھا بے شک
کب کوئی اس کی تمنّا کبھی ٹالی ہم نے
وہ سمجھ دار ہے مطلب تو سمجھ جائے گا
بات آدھی ہی کہی، آدھی چُھپالی ہم نے
کھیل رنگوں کا جو پھولوں سے سمجھ میں آیا
سیکھ لی خوشبو سے آوارہ خیالی ہم نے
جو دعا کرتے تھے اُلٹا ہی اثر ہوتا تھا
تیری چاہت کی دعا رب سے بچالی ہم نے
یونہی تُک بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدؔر
بھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

☆☆☆

شوق جو سود یا زیاں کے تھے
سلسلے وہم اور گماں کے تھے
طُور سے بڑھ کے اپنا حال ہوا
صرف اک بار مَن میں جھانکے تھے
جانے کیسے یہاں چلے آئے
ہم کسی دوسرے جہاں کے تھے
رنگ سارے نظر کا تھے جادو
اور سب ذائقے زباں کے تھے
قسمتوں نے ملا دیا ورنہ
تم کہیں کے تھے، ہم کہاں کے تھے

داستاں گو کی ذات سے اُبھرے
جتنے کردار داستاں کے تھے
آج تو کُھل کے ہنس دیئے حیدرؔ
دل کے زخموں کے جتنے ٹانکے تھے

☆☆☆

عشق کی دنیا کے اَن دیکھے نگر رہتے ہیں
عُمر تھوڑی سی ہے اور اِتنے سفر رہتے ہیں
ابھی کچھ اور چکانے ہیں زمانے کے حساب
اِس کے کچھ قرض ابھی تک مِرے سر رہتے ہیں
کبھی سوچا ہی نہیں آپ نے، یہ کون ہیں جو
اپنا گھر ہوتے ہوئے آپ کے گھر رہتے ہیں
شہر اک اور وہاں آپ ہی بَس جاتا ہے
جس جگہ جا کے ترے شہربدر رہتے ہیں
متلاطم ہے ابھی تک مِرے دل کا دریا
اور دریا میں بہت سارے بھنور رہتے ہیں
جسم کا سحر، طلسم آنکھ کا، لب کے منتر
اُس میں بھی کتنے فسوں ساز ہنر رہتے ہیں
چور سا آن چھپا ہے مِرے من میں حیدرؔ
اُس کے سینے میں بھی سو طرح کے ڈر رہتے ہیں

☆☆☆

مستی میں جا رہا ہوں
دھومیں مچا رہا ہوں
دریا ہوں اور اپنی

موجیں اڑا رہا ہوں
نظروں سے گر گئے ہو
دل سے اُٹھا رہا ہوں
کیسا جلا گئے ہو
بجھتا ہی جا رہا ہوں
سو جاؤ نیند بھر کے
خوابوں میں آ رہا ہوں
چوری پکڑ نہ لے وہ
نظریں چرا رہا ہوں
ناممکنات حیدرؔ
ممکن بنا رہا ہوں

☆☆☆

آگ اپنے خون سے آخر بجھانی پڑ گئی
کس قدر مہنگی اسے شعلہ بیانی پڑ گئی
صبر کو میرے جو میری بے بسی سمجھے رہا
دیکھ کیسے اُس پہ میری بے زبانی پڑ گئی
ایک مدت سے الگ ہیں جب ہمارے راستے
پھر مِرے قصے میں کیوں تیری کہانی پڑ گئی
تجھ تلک پہنچا ہوں خاصی دیر سے عمرِ کہن
پہلے آنا تھا مگر رہ میں جوانی پڑ گئی
اعتبار اک دوسرے پر کب ہمیں تھا زندگی
جھُوٹی مُوٹی دوستی تھی اور نبھانی پڑ گئی
مُشک جیسی کوئی بھی شے کب چھُپانے سے چھپی

آپ کو پھر کس لئے صاحب چھپانی پڑ گئی
خوب واقف تھے کسی کے پیار سے حیدؔر مگر
آزمائی چیز پھر سے آزمانی پڑ گئی

☆☆☆

درد و غم سے اسے نکھارتا ہے
عشق انسان کو سنوارتا ہے
برف، بادل، ندی، سمندر، اَشک
پانی بھی کتنے روپ دھارتا ہے
باقی جتنی ہے زندگی دل کی
نذر تیری اِسے گزارتا ہے
اُس پہ سارا معاملہ چھوڑا
اب ڈبوتا ہے چاہے تارتا ہے
خود ہی مطعون ہو گیا آخر
جو فقیروں کو طعنے مارتا ہے
میں تو ساحل کی ریت ہوں پیارے
ریت سے کون گھر اُسارتا ہے
مسترد کرکے جھوٹی تاریخیں
وقت خود جھوٹ سچ نتارتا ہے
کس نے اندر کے در سے دی ہے صدا
کون ہے اور کسے پکارتا ہے
اک فرشتہ ہے عشق کا حیدؔر
مجھ پہ جو شاعری اُتارتا ہے

☆☆☆

تمہارے نام کے ساتھ اپنے نام کا مطلب
وہی جو ہوتا ہے رادھا سے شام کا مطلب
جو اپنی ہجر بھری زندگی گذار گیا
وہ جان لے گا وصالِ دوام کا مطلب
اُسے خبر ہے کہ رُوئے سخن ہے کس جانب
کہاں وہ سمجھے گا میرے کلام کا مطلب
نمازِ عشق تو پروانہ وار ہوتی ہے
پھر اس میں سجدۂ رکوع و قیام کا مطلب
سجایا خانۂ دل جن کے واسطے حیدرؔ
وہی نہ سمجھے مِرے اہتمام کا مطلب

☆☆☆

جب اُس نے خاک اُڑانے کا ارادہ کرلیا ہے
تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کر لیا ہے
حدیں وہ کر گیا ہے پار سب جورو ستم کی
سو ہم نے صبر پہلے سے زیادہ کر لیا ہے
نہیں، اس جیسی عیاری تو ممکن ہی نہیں تھی
زمانے سے ذرا بس استفادہ کر لیا ہے
کچھ ایسا ہے کسی کی سر زمینِ دل کا جادو
محبت کا سفر اب پا پیادہ کر لیا ہے
چلو حیدرؔ غنیمت ہے یہ صندل کی مہک بھی
کہ یاروں نے تو لکڑی کا برادہ کر لیا ہے

☆☆☆

صحراؤں کے دامن میں سمندر نہیں رکھا

اب آنکھوں میں ایسا کوئی منظر نہیں رکھا
غم ہو یا خوشی ہو، وہ محبت ہو کہ نفرت
ہم نے کوئی جذبہ بھی چھپا کر نہیں رکھا
دیکھو مجھے اِس حال میں‌مت چھوڑ کے جانا
دل پر ابھی میں نے کوئی پتھر نہیں رکھا
رہ جائے بھرم یاروں کی خوش قامتیوں کا
خود کو کبھی یاروں کے برابر نہیں رکھا
گو عقل کی ہم فہم و فراست کے ہیں قائل
لیکن اِسے دل کا کبھی افسر نہیں رکھا
انمول رتن بننے سے بے مول ہی اچھے
سر جبر کی سرکار کے در پر نہیں رکھا
لے آئے ہیں ہاتھوں پہ اٹھائے ہوئے حیدؔر
اوروں کی طرح شانوں پہ یہ سر نہیں رکھا

☆☆☆

آپ کو بھی درپئے آزار ہونا تھا، ہوئے
اور ہم نے زیرِ بارِ یار ہونا تھا، ہوئے
تہمتوں کے اور بہتانوں کے اعزازات کو
جب ہمارے ہی گلے کا ہار ہونا تھا، ہوئے
لاکھ صحرا اور سمندر بچھ گئے تھے راہ میں
اِن فقیروں نے جہاں سے پار ہونا تھا، ہوئے
خواب کی دنیا میں کتنی دیر تک رہتے بھلا
اک نہ اک دن تو ہمیں‌بیدار ہونا تھا، ہوئے
عشق میں تکریم بھی اپنا مقدر تھی، ہوئی

اور پھر رُسوا سرِ بازار ہونا تھا، ہوئے
یہ بھی آنا تھا مقام آخر تمہاری چاہ میں
ہم نے اپنے آپ سے بے زار ہونا تھا، ہوئے
ذہن و دل کی جنگ میں خاموش رہتے کس طرح
خود سے حیدرؔ برسرِ پیکار ہونا تھا، ہوئے

☆☆☆

دریا کہ نہر میں ہوں
پر اپنی لہر میں ہوں
کہنے کو صرف پل بھر
اور سارے دہر میں ہوں
پتھر کے لوگ سارے
جادو کے شہر میں ہوں
یہ کون مہرباں ہے
یہ کس کے قہر میں ہوں
تریاق بن کے حیدرؔ
نفرت کے زہر میں ہوں

☆☆☆

روشنی کا استعارہ کر لیا
دل نے ہر آنسو ستارا کر لیا
بے وفا دنیا سے کچھ تو نبھ گئی
ساتھ کیا تھا بس گزارا کر لیا
گلستاں اُس نے کیا تھا آگ کو
ہم نے شبنم کو شرارہ کر لیا

کم نہیں ہم بھی ثمود و عاد سے
کیوں لحاظ آخر ہمارا کر لیا
تیری وحدت سے سمجھ پائے تجھے
اور کثرت میں نظارہ کر لیا
کون ہے پھر اب مِرے دُکھ کا سبب
خواہشوں سے تو کنارا کر لیا
آج حیدؔر موڈ ہی کچھ اور تھا
سو غزل میں استخارہ کر لیا

☆☆☆

عروج کیا ہے، زوال کیا ہے
خوشی ہے کیا اور ملال کیا ہے
یہ گردشِ ماہ و سال کیا ہے
زمانے! تیری یہ چال کیا ہے
بھلے ہو وقتی اُبال چاہت
مگر یہ وقتی اُبال کیا ہے
ہوس تو بے شک ہوس ہی ٹھہری
پہ جستجوئے وصال کیا ہے
ہے دل کوئی بے کنار صحرا
کہ آرزوؤں کا جال، کیا ہے
حقیقتیں تو فریب نکلیں
جہانِ خواب و خیال کیا ہے
سوال جو اتنے کر رہے ہو
تمہارا اصلی سوال کیا ہے

ہر ایک رنجش بھلا چکے ہو
تو دل کے شیشے میں بال کیا ہے
خدا ہے مشکل کُشا تو حیدرؔ
کوئی بھی کارِ محال کیا ہے

☆☆☆

موسم کی بے مہر فضا میں گرتے ہیں
سوکھے پتے سرد ہوا میں گرتے ہیں
رہتی ہے پرواز کی خوش فہمی اُن کو
جو اپنے اندر کے خلا میں گرتے ہیں
گرتے ہیں تو گرتے ہی جاتے ہیں پھر
اہلِ ستم جب مکروریا میں گرتے ہیں
گیت سناتے ہیں جھرنے کے گرنے کا
حرف جو خاموشی کی صدا میں گرتے ہیں
تم نے وہ منظر ہی کب دیکھے ہیں، جب
درد سمندر، دل دریا میں گرتے ہیں
یا آنکھوں میں خاک برستی تھی حیدرؔ
یا اب پیہم اَشک دُعا میں گرتے ہیں

☆☆☆

جو بَس میں ہے وہ کر جانا ضروری ہو گیا ہے
تری چاہت میں مَر جانا ضروری ہو گیا ہے
ہمیں تو اب کسی اگلی محبت کے سفر پر
نہیں جانا تھا' پر جانا ضروری ہو گیا ہے
ستارا جب مِرا گردش سے باہر آرہا ہے

تو پھر دل کا ٹھہر جانا ضروری ہو گیا ہے
درختوں پر پرندے لَوٹ آنا چاہتے ہیں
خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہو گیا ہے
اندھیرا اِس قدر گہرا گیا ہے دل کے اندر
کوئی سورج اُبھر جانا ضروری ہو گیا ہے
بہت مشکل ہوا اندر کے ریزوں کو چھپانا
سو اب اپنا بکھر جانا ضروری ہو گیا ہے
تجھے میں اپنے ہر دُکھ سے بچانا چاہتا ہوں
ترے دل سے اُتر جانا ضروری ہو گیا ہے
نئے زخموں کا حق بنتا ہے اب اِس دل پہ حیدر
پُرانے زخم بھر جانا ضروری ہو گیا ہے

☆☆☆

وہ جو ابھی تک خاک میں رُلنے والے ہیں
سُچے موتیوں میں اب تلنے والے ہیں
اپنی ذات کے دروازے تک آپہنچے
بھید ہمارے ہم پر کھلنے والے ہیں
دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم
سو اب اُس کے عشق میں گھلنے والے ہیں
واقفیت ہے اِن سے اپنی برسوں کی
دُکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں
آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری
حیدر مَیل دِلوں کے دُھلنے والے ہیں

☆☆☆

اس دربار میں لازم تھا اپنے سر کو خم کرتے
ورنہ کم از کم اپنی آواز ہی مدھم کرتے
اس کی انا تسکین نہیں پاتی خالی لفظوں سے
شاید کچھ ہوجاتا اثر، تم گریۂ پیہم کرتے
سیکھ لیا ہے آخر ہم نے عشق میں خوش خوش رہنا
درد کو اپنی دوا بناتے، زخم کو مرہم کرتے
کام ہمارے حصے کے سب کرگیا قیس دوانہ
کونسا ایسا کام تھا باقی جس کو اب ہم کرتے
ہر جانے والے کو دیکھ کے رکھ لیا دل پر پتھر
کس کس کو روتے آخر،کس کس کا ماتم کرتے
دل تو ہمارا جیسے پتھر سے بھی سخت ہوا تھا
پتھر پانی ہو گیا،سوکھی آنکھوں کو نم کرتے
بن جاتا تریاق اسی کا زہر اگر تم حیدرؔ
کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اس پر دَم کرتے

☆☆☆

اک خواب کہ جو آنکھ بھگونے کے لئے ہے
اک یاد کہ سینے میں چبھونے کے لئے ہے
اک زخم کہ سب زخم بھلا ڈالے ہیں جس نے
اک غم کہ جو، تا عمر بلونے کے لئے ہے
اک روح کہ سونا ہے مگر مَیل بھری بھی
اک آگ اسی مَیل کو دھونے کے لئے ہے
آنکھوں میں ابھی دھول سی لمحوں کی جمی ہے
دل میں کوئی سیلاب سا رونے کے لئے ہے

دل کو تو بہت پہلے سے دھڑکا سا لگا تھا
پانا ترا شاید تجھے کھونے کے لئے ہے
کشتی کا یہ ہچکولہ ، یہ ملاّح کا چکّر
کشتی کو نہیں، مجھ کو ڈبونے کے لئے ہے
تقدیر سے لڑ سکتا ہے کوئی کہاں حیدؔر
وہ حادثہ ہونا ہے جو ہونے کے لئے ہے
☆☆☆

به فیض بابا بلھے شاہ

رقص کناں ہے جس کے اندر ازل، ابد کا مور
وہ ہے اک بے انت خلا سا جس کی اور نہ چھور
اک دل کا پھیلا صحرا ، خاموشی سے معمور
اک کم ظرف سمندر ،جس میں خالی خولی شور
سارے حوالے برکت والے نور بھرے دربار
کوٹ مٹھن،اجمیر شریف اور دہلی ، اور لاہور
حال،دھمال سے تن من روشن،روشن ہو گئی جان
جگمگ کر اٹھی ہو جیسے ایک اندھیری گور
اپنی اڑانیں، ساری شانیں،تیرے دَم سے یار
تیرے ہاتھ ہوائیں ساری تیرے ہاتھ میں ڈور
رشتے ناطے اور تعلق کیسے میرے یار!
کب کچھ مان کسی پر اپنا، کب کچھ اپنا زور
مَن سے لے کر بُکل تک ہوں ویران و حیران
چوری کرنا چھوڑ گئے ہیں میرے سارے چور
سات سمندر سے تو اپنے پاپ نہیں دُھل پائے

تو ہی بھیج اب دل کے صحرا کوئی گھٹا گھنگھور!
حیدؔر نے پہچان کے تجھ کو جانا تیرا بھید
''بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پئے کوئی ہور''

☆☆☆

آنکھ سے گر کر ٹوٹے خواب کھلونے ہیں
اور اب دل کے ، بچوں جیسے رونے ہیں
عمرِ لا حاصل کا جو حاصل ٹھہرے
کس نے ایسے داغِ ملامت دھونے ہیں
درد ہمارے تو انمول نکل آئے
گرچہ خرید ے ہم نے اونے پونے ہیں
صرف گناہوں کا ہی بوجھ نہیں سر پر
اپنے نیک اعمال بھی ہم کو ڈھونے ہیں
رادھےؔ،میٹھے رادھے! کچھ پہچان ذرا
دیکھ ہمیں ہم تیرے شام سلونے ہیں
زخموں کی خیرات بھی کب مل پائے گی
حُسن سے کچھ احسان ہی ایسے ہونے ہیں
راس زمینِ دل کو غم ایسے آئے
غم کی فصلیں کاٹ کے،پھر غم بونے ہیں
یادوں کے پھولوں سے،اپنی پلکوں نے
اُس کی جیت پہ حیدؔر ہار پرونے ہیں
عشق میں حیدؔر باون سال کا ہو کے بھی
بیس برس کی عمر کے رونے دھونے ہیں

☆☆☆

کون انگڑائی سی لیتا ہے نفس کے اندر
لذتِ وصل مہکتی ہے ہوس کے اندر
پھر سے در پیش ہوا لگتا ہے باہر کا سفر
لہر سی اُٹھنے لگی ہے کوئی نَس کے اندر
رَس بنایا گیا اس زندگی کو پہلے، پھر
موت کا زہر ملایا گیا رَس کے اندر
پھول نے صرف بکھیری ہے مہک بھینی سی
اصل خوشبو تو وگرنہ ہے سِرِرَس کے اندر
قافلے والے بہت خوش تھے دَمِ رخصت تو
سسکیاں کس کی تھیں آوازِ جرس کے اندر
کُن کا اک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اترا
آسماں ہو گئے تخلیق قفس کے اندر
حیدؔر اک اور ہی دنیا ہے یہ انٹرنیٹ کی
کیا سے کیا ہو گیا ہوں سات برس کے اندر

☆☆☆

یہ واقعہ ہوا اپنے وقوع سے پہلے
کہ اختتامِ سفر تھا ، شروع سے پہلے
نہیں تھی لذتِ سجدہ، رکوع میں لیکن
اک اور کیف تھا،کیفِ خشوع سے پہلے
نصوص کو بھی کبھی دیکھ لیں گے فرصت میں
ابھی نمٹ تو لیں''مومن'' فروع سے پہلے
معافی مانگنا پھر بعد میں خلوص کے ساتھ
گناہ کرنا خشوع و خضوع سے پہلے

اُسی کے پاس تو جانا ہے لوٹ کر آخر
سو خوب گھومئے ، پھریئے ، رجوع سے پہلے
سیاہِ شب نے تو اندھیر کر دیا تھا بہت
سو آ گیا ہوں میں وقتِ طلوع سے پہلے
یہ عید آئی ہے کس قتل گاہ میں حیدرؔ
سلام پھیر لیا ہے رکوع سے پہلے

☆☆☆

جیسی بھی ہے اس دنیا سے کٹ کر نہیں رہنا
جب پیار بڑھانا ہے تو ڈٹ کر نہیں رہنا
دُوری بھی مٹانی ہے محبت کے سفر میں
اک حد کو بھی رکھنا ہے،لپٹ کر نہیں رہنا
اپنوں کو تو کچھ اور بھی نزدیک کریں گے
سوچا ہے کہ غیروں سے بھی ہٹ کر نہیں رہنا
لازم ہے سنا جائے کھلے ذہن سے سب کو
اپنے ہی خیالات میں اَٹ کر نہیں رہنا
جتنا ہوں حقیقت میں ، وہی دِکھنا ہے مجھ کو
اوروں کے لیے بڑھ کے یا گھٹ کر نہیں رہنا
کچھ اپنے دل و ذہن کو نزدیک کیا ہے
اندر بھی زیادہ ہمیں بٹ کر نہیں رہنا
رہنا ہے بہر حال یہیں پر ہمیں حیدرؔ
دنیا سے مگر اتنا چمٹ کر نہیں رہنا

☆☆☆

کوئی آوارہ ہے یا بھٹکی ہوئی ہے زندگی

موت کی نظروں میں جو کھٹکی ہوئی ہے زندگی
شور سنتے تھے بہت لیکن حقیقت اور ہے
ایک ہی تو سانس پر اٹکی ہوئی ہے زندگی
کربلا کی خاک پر روندی گئی ہے اور کبھی
نفرتوں کی دار پر لٹکی ہوئی ہے زندگی
دھوپ میں ٹھنڈک،تمازت گھل گئی ہوں جس طرح ایسے
سارے دہر میں چھٹکی ہوئی ہے زندگی
رنگ و خوشبو کا کوئی جادو اسی کے دَم سے ہے
گلشنِ ہستی میں جو چٹکی ہوئی ہے زندگی
یہ تو بس موّاج لہروں کا انوکھا کھیل ہے
کب کسی ساحل،کسی تٹ کی ہوئی ہے زندگی
اور تھے حیدؔر جو اس کی چاہ میں مرتے رہے
ہم نے الٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی

☆☆☆

ترا مقصود ہو کر رہ گیا ہے
یہ دل محدود ہو کر رہ گیا ہے
جو ناموجودیت میں بیکراں تھا
وہ بس موجود ہو کر رہ گیا ہے
جہاں ملنے تھے اپنے دل،وہ رستہ
بہت مسدود ہو کر رہ گیا ہے
زیاں کے شوق میں نکلے تھے لیکن
زیاں بھی سود ہو کر رہ گیا ہے
بڑی ''مقبولیت'' حاصل تھی اس کو

بڑا مردود ہو کر رہ گیا ہے
کسی پر آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے
کوئی نمرود ہو کر رہ گیا ہے
سدا انکار تھی پہچان جس کی
سراپا جُود ہو کر رہ گیا ہے
بہت ہی پیار وہ کرتا ہے مجھ سے
وہ کب معبود ہو کر رہ گیا ہے
کبھی شعلۂ جوّالہ تھا، حیدر
یہ دل اب دُود ہو کر رہ گیا ہے

☆☆☆

نہ جانے کیوں تمناؤں کی طغیانی میں رکھا ہے
ابھی تک دل نے خود کو عہدِ نادانی میں رکھا ہے
یہ کیسا آئنہ رُو اب کے میرے روبرو آیا
مجھے جس نے مسلسل ایک حیرانی میں رکھا ہے
کوئی خواہش ہو،اب کہتے ہی فوراً مان لیتا ہے
ستم گر نے مجھے اب بھی پریشانی میں رکھا ہے
عنایت میں بھی اک طرزِ ستم محسوس ہوتا ہے
نہ لاؤں تاب جس کی ایسی تابانی میں رکھا ہے
دکھائی شانِ فقراپنی تمہاری بادشاہی میں
فقیری عجز اپنے عہدِ سلطانی میں رکھا ہے
ہے میری روح میرے جسم کے ہر ذرّہ میں پنہاں
تو اپنے جسم کو اک شہرِ روحانی میں رکھا ہے
دیارِ حُسن میں خیرات کی خواہش نہیں رہتی

بخیلوں نے بخیلی کو فراوانی میں رکھا ہے
بہت سی بے نیازی اور اک یادوں بھری گٹھڑی
بڑا سامان اپنی خستہ سامانی میں رکھا ہے
یہاں سے رونقیں دکھ درد کی جاتی نہیں حیدرؔ
دکھوں کا ایسا میلہ اپنی ویرانی میں رکھا ہے

☆☆☆

گیان،دھیان کے رستوں پر اب اور نہ مجھ کو رول
میرے مالک! مجھ پر میرا ساتواں دَر بھی کھول
ایک نئے آدم کی پھر تشکیل ہے میٹھے پانی!
جذب ہو میری مٹی میں یا مجھ کو خود میں گھول
دنیا کو سمجھائیں کیسے، آخر کیسے سمجھے
باتیں اپنی سچی،سیدھی اور دنیا ہے گول
قیمت اپنی کچھ بھی نہیں تھی، شان ہے اُس پیارے کی
یاروں نے بے مول کیا تھا، اُس نے کیا اَنمول
کب اپنی پہچان کے سارے بھید کھلے ہیں خود پر
جھانک ابھی کچھ اور بھی اندر،من کو اور ٹٹول
کتنی اور زمینیں تیرا رستہ دیکھ رہی ہیں
اس دھرتی سے آگے چل،اب اُڑنے کو پر تول
دُکھ اور سُکھ کے اتنے ہی میلے تھے بس قسمت میں
جیون کے اس کھیل میں اپنا اتنا ہی تھا رول
راضی ہوں تیری مرضی پر لیکن بھید کھلے بھی
تیری مرضی کیا ہے یارا، کچھ تو کھل کر بول
ہجر کی رُت میں بھی پیغام وصال کا آیا حیدرؔ

دیکھ! بُلاوا آیا ہے تو مت کر ٹال مٹول

☆☆☆

عشق میں سب کچھ اک جیسا ہے،کیا پانا،کیا کھونا
لذت میں ملتا جلتا ہے ہنسنا ہو یا رونا
ساری ریاضت خاک ہوئی اور زعمِ کرامت ٹوٹا
اک درویش پہ چل گیا ایسا حُسن کا جادو ٹونا
جن و ملک سب سے اُکتا کر رب نے بنایا،آخر
سانسوں کی چابی سے چلنے والا ایک کھلونا
سُن یارا! مت اُلجھ تُو اُس سے جس کی ایک نظر ہی
سونے کو مٹی کردے، مٹی کو کردے سونا
زہریلی نفرت کا موسم جتنا زہریلا ہو
اپنی آنکھوں میں سچی چاہت کے خواب ہی بونا
ہم ہی کتنی دیر سے ساری بات کیے جاتے ہیں
اتنی دیر سے چُپ بیٹھے ہو،تم بھی کچھ تو کہو نا!
ڈر ہے رازوں کے افشا کا موجب نہ بن جائے
حیدرؔ بھید بھرے دل کا اب چھید بھرا دل ہونا

☆☆☆

نظمیں

خلا

کبھی تم دل میں بستے تھے
تو آنکھوں میں
کہیں اندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔
بہاریں مسکراتیں،
کہکشائیں رقص کرتی تھیں
زمین و آسماں میں
ایسی یکتائی کا عالَم تھا
خلا کیسا؟
کہیں اک درز تک بھی تو نہیں
معلوم ہوتی تھی

مگر پھر یوں ہوا، اک دن
دھماکہ سا ہوا کوئی
زمین و آسماں میں اک دوئی
پیدا ہوئی
پھر فاصلہ در فاصلہ
اک سلسلہ بنتا گیا
اور اب یہ عالَم ہے
بہاریں کھو چکی ہیں

کہکشائیں بجھ گئی ہیں
اور مری آنکھوں میں
اک اندھا خلا ہے
دور تک پھیلا ہوا، جس میں
لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کو سجائے
چپ کھڑی ہے میری تنہائی،
اور اس کے گرد
اک سفّاک سناٹا
مسلسل رقص کرتا ہے!

☆☆☆

درد

گہرے سناٹے میں
دُور سے
کالے انجن کی سیٹی کی آواز آتی ہوئی
دل کو بھاتی ہوئی
اک لرزتی، سسکتی صدا

دُور ہوتے ہوئے
کسی تانگے کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز
تانگے کے پہیوں کی آواز سے مل کے
کوئی انوکھا سا جادو جگاتی ہوئی
دکھ کا احساس دیتے ہوئے

دُور ہوتے ہوئے
منظروں کی صدا

چوڑیوں کی چھنک
ٹوٹتی چوڑیوں کی چھنک
زخم خوردہ مگر مسکراتے ہوئے
گیت گاتی چھنک

بانسری کی دُکھی اور سُریلی صدا
سَرخوشی اور دُکھ کے رَچاؤ سے
دل میں کچھ ایسے اترتی ہوئی
جیسے الہام ہو

یہ ساری صدائیں مِری آشنا ہیں
مجھے جانتی ہیں
میں اِن سب کو پہچانتا ہوں
متاعِ فقیراں--------
یہ سب میرے دردوں کی آواز ہیں
درد
جو میرے مونس ہیں
ماں جائے ہیں!

☆☆☆

دھند

یہ کیسی دُھند سی پھیلی ہے
میرے چار سُو
کچھ بھی نظر آتا نہیں
چاروں طرف مہکے ہوئے، پھیلے ہوئے
شادابیوں، زرخیزیوں کے
کتنے ہی منظر ہیں
لیکن دُھند نے سارے مناظر
اپنے دامن میں کچھ اِس ڈَھب سے چھُپائے ہیں
مری نظریں کسی منظر کو بھی چھو ہی نہیں پاتیں
مگر کانوں میں سارے منظروں کی
مدھ بھری جھنکار پیہم گونجتی ہے
کوئی انجانی (یا شاید جانی پہچانی سی)
راحت بخشتی ہے

صدا جھنکار اور چہکار کی صورت
رگِ جاں تک اُترتی ہے، لہو میں بولتی ہے
روح میں رس گھول دیتی ہے
مگر دل میں نہیں آتی
کہ دل کے دیس میں آنے کے سارے راستے
آنکھوں سے آتے ہیں

یہ کیسی دُھند ہے جس نے مجھے تقسیم کر کے رکھ
دیا ہے
مِرا دل میری جاں کی
اور مری جاں، میرے دل کی جستجو میں ہے
مگر دونوں میں کوئی ربط ہو پایا نہیں جیسے

عجب سی دُھند پھیلی ہے
سبھی منظر صدا کے رُوپ میں ہی مجھ سے ملتے ہیں
یہ دلکش دُھند
دو قطروں کی صورت
جب سے اِن پلکوں پہ ٹھہری ہے!
☆☆☆

صدا کا سمندر

فضا میں سمندر کی لہروں سی آواز ہے
سمندر کے ساحل سے اس وقت میں
سینکڑوں میل کے فاصلے پہ ہوں، پھر
یہ فضا میں سمندر کی لہروں کی موسیقی
کیوں نشر ہوتی چلی جا رہی ہے
انوکھی صدائیں امنڈتی چلی آ رہی ہیں
مِری رُوح پر چھا رہی ہیں

دسمبر کی یخ بستہ صبحوں میں

سورج نکلنے سے پہلے، فضا میں
پہاڑوں کے کوؤں کی ڈاریں اڑی جارہی ہیں
انہیں کی صدائیں
سمندر کی لہروں کی میٹھی،
سریلی صداؤں میں ڈھل کے
پہاڑوں کے دامن میں
الہام بن کر اترتی چلی جاتی ہیں
اور میں اس فضا میں، صدا کے سمندر میں
پرواز کرتا ہوا تیرتا جارہا ہوں!

☆☆☆

منی پلانٹ

زمین سے جُڑا رہوں
تو تب بھی لہلہاؤں میں
زمیں سے کاٹ کر مجھے
بوتلوں میں پانی بھر کے ڈال دو
تب بھی میں ہرا رہوں
پَیر ہی جمانے کی مجھے کہیں جگہ ملے
میں جہاں بھی جا بسوں
وہیں ہرا بھرا رہوں
بلکہ میں جہاں رہوں
نصیب اُس کے جاگ اُٹھیں
میں کوئی خشک شاخ تو نہیں
کسی درخت کی!

☆☆☆

یہ دل

کبھی یہ قرب کے لمحوں میں
فرقت کی سزا مانگے
کبھی یہ ہجر کے عالم میں
وصلِ جاوداں چاہے
کبھی یونہی اُداسی میں گھرا ہو
اور یونہی ہنس پڑے......پھر
پاگلوں کی طرح بس ہنستا چلا جائے
ہنسے اتنا کہ میری آنکھ سے
آنسو ڈھلک آئیں
مِری آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی
آپ بھی بے ساختہ رونے لگے
روتا چلا جائے
میں ہنسنے اور رونے کا سبب
کیا جان پاؤں گا
تمہارے ہجر کی ساعت ہو چاہے وصل کا لمحہ
مگر یہ دل،
یہ پاگل دل، سمجھ میں ہی نہیں آئے
یہ دل ہے یا کوئی کردار اگلی داستانوں کا!

☆☆☆

ایک دراوڑ کا پیغام
آریاؤں کے نام!

ہزاروں سال پہلے تم
ہوا کے تند جھونکوں کی طرح آئے
ہماری سرزمیں کو روندتے
تم نے گذرنا تھا
مگر تم تو بگولے بن گئے جیسے
جو باغوں، جنگلوں، کھیتوں کو
بس تاراج کرتے تھے
جو ہم پر راج کرتے تھے
تمہارے رقصِ جشنِ فتح میں
صدیوں تلک اڑتے رہے تھے
اصل باشندوں کی آزادی کے،
ان کی عزت وناموس کے ٹکڑے
ہمیں محکوم کر کے تم رہے صدیوں تلک نازاں
یہاں پھر جو ہوا وہ سب الگ قصہ کہانی ہے
چلو چھوڑو اب اس قصے، کہانی کو،
نیا قصہ سنو!
اب میں دراوڑ

خود تمہاری سرزمیں پر آنے کو تیار بیٹھا ہوں
مگر اندھے بگولے کی طرح ہرگز نہیں
میں تو فقط بادِ صبا کے نرم جھونکے
کی طرح دھیرے سے آؤں گا
تمہارے گلشنوں کو تاخت و تاراج
کرنے کو نہیں، میں ۔۔۔۔۔ بلکہ ان کی
خوشبوؤں کو اپنے من میں
جذب کرنے کے لئے آؤں گا اور
اپنی محبت کے وسیلے سے مجھے
اب آریاؤں کے دلوں پر راج کرنا ہے
سنو، اے آریاؤ!
میں تمہارے پاس آنے کے لئے تیار بیٹھا ہوں!

☆☆☆

ایک خواہش کی موت

وہ اک بھولی بھالی سی صحرائی خواہش
جو اِس دل کے صحرا میں بستی تھی
آنکھوں میں اُمید کی روشنی کے دیئے سے
جلاتی
کبھی دل کے زَم زَم سے چھینٹے اُڑاتی
وہ میرے ہی چھینٹوں سے مجھ کو بھگو کر جو ہنستی
تو جیسے مِرے دل کا صحرا
کھجوروں کے سرسبز میٹھے پھلوں والے

اونچے درختوں کی ٹھنڈک میں
ساری بہاریں سمیٹے ہوئے مسکراتا

مِرے دل کا صحرا کھجوروں کے سرسبز
میٹھے پھلوں والے
اونچے درختوں کی ٹھنڈک میں ساری بہاریں
سمیٹے ہوئے مسکراتا تو دہکے ہوئے گرم سورج
کے سینے میں بھی پھول سے کھلنے لگتے

مگر ایک دن کیا ہوا
جانے کیسے ہوا
وہی بھولی بھالی سی صحرائی خواہش
مجھے چھوڑ کر چاند میں جابسی
پتھروں کے نگر میں وہ جاتے ہوئے
میرے صحرائے دل کو بھی ہمراہ لیتی گئی
اس کے بدلے میں وہ مہرباں
میری آنکھوں کو کوئی سمندر عطا کر گئی
تب سے آنکھوں کو بخشا ہوا یہ سمندر
سدا چاند کی سمت
امنڈتا، چھلکتا
ہمکتا ہی رہتا ہے!

☆☆☆

سرسوں کا کھیت

یہ بے اَنت میدان
میدان میں کیاریاں
ہر کیاری میں ہریالیوں کی قطاریں
یہ پودوں کی ہریالیاں اپنی ساری نمو
پیلے پھولوں کو دے کر
انہیں اپنے سر پر سجائے ہوئے جھومتی ہیں
یہ ہریالیاں، یہ خوشی اور مسرت کے پیکر
مگر پیلے پھول ان پہ دکھ کا نشاں ہیں
خوشی اور دُکھ کے ملن کا
انوکھا سماں ہے

یہ بے انت میدان
سرسوں کے سرسبز پودوں سے،
پودوں پہ پھولوں سے
غم اور خوشی سے اَٹا ہے
مرے دل کے نزدیک آؤ تو دیکھو یہ میدان کیا ہے!

☆☆☆

چلو اک نظم لکھتے ہیں

وہی موسم، وہی رستے،
وہی شام وسحر، یکسانیت، بے کیف سے لمحے
گنہ کی رغبتیں، اشکِ ندامت
نیکیوں کی لذتیں
اسرار جتنے ہو چکے ہیں منکشف،
اپنا تحیر کھو چکے ہیں
اب مسرّت غم زدہ ہے
اور حیرت کی چمک بجھنے لگی ہے،
جستجو سونے لگی ہے

بدن سے روح تک کے کتنے ہی اسرار تھے
جو کھل چکے کب کے
کسی تپتے ہوئے صحرا کی گرمی پی گئے دریا
عجب سیرابیاں تھیں، پیاس کی لذت ہی کھو بیٹھے
نہ اب کوئی غزل یا ماھیا کہنے کی
اندر سے کوئی تحریک ہوتی ہے
نہ سردی اور گرمی میں کوئی تفریق ہوتی ہے

چلو ٹھہرے ہوئے ان موسموں میں
کوئی تبدیلی سی لاتے ہیں
تحیّر کی نئی دنیاؤں کی سوئی ہوئی سی

جستجو بیدار کرتے ہیں، مسّرت کو ہنساتے ہیں
چلو اس بلب کا سوئچ آف کر کے
موم بتی کو جلاتے ہیں
قلم کاغذ اٹھاتے ہیں
کئی برسوں کی اس یکسانیت کی گرد کو
سر سے جھٹکتے ہیں
ذرا رستہ بدلتے ہیں
چلو اک نظم لکھتے ہیں!

☆☆☆

مبارک باد اور پُرسہ

صلاح الدین!
میری اور تمہاری دکھ کہانی ایک جیسی ہے
تمہاری دکھ کہانی کے سبھی کردار
میری داستاں میں صرف اپنے نام کی
تبدیلیوں کے ساتھ آتے ہیں
وہی سفّاک اور بے رحم، نفرت کے پجاری
زندگی میں زہر سا گھولے چلے جاتے ہیں۔۔۔۔
دھرتی کو بدل لوں، سوچ کے انداز کو، ایمان کو اور
زندگی کے گیان کو بھی چھوڑ دوں
تب بھی یہ ظالم لوگ سُکھ کا سانس لینے ہی نہیں دیتے
خدا جانے یہ مجھ سے کس لئے خائف ہیں؟
کیوں مجھ کو ڈراتے ہیں؟

صلاح الدین! ان سفّاک کرداروں کی سفّا کی سے
اتنا جان پایا ہوں کہ میں جیسے منو کے دور کا شودر ہوں
اپنے ہر جنم، ہر دَور میں، ہر حملہ آور کا نشانہ ہوں
صلاح الدین! میری اور تمہاری دکھ کہانی ایک جیسی ہے
تو پھر اس دکھ کا رونا کیوں تمہارے سامنے روؤں
چلو اس دکھ کہانی کے ملن کی اس خوشی میں
میری جانب سے مبارک باد اور پُرسہ!

☆☆☆

اجنتا کے غار کی ایک تصویر

(یہ نظم میرا جی کی نظم ''اجنتا کے غار'' سے متاثر ہو کر اور ایک تصویر کو دیکھ کر لکھی گئی)

ابھی کی بات ہے شاید یا کل کی، ایسے لگتا ہے
مگر یہ بات تو صدیوں پرانی ہے
ہم اپنے پیار میں کھوئے ہوئے
اک دوسرے میں خود کو جیسے ڈھونڈتے تھے
ہمارا کھیل ابھی جاری تھا
جب تاریخ کے صفحات پر آندھی چلی
خانہ بدوشوں کے مقدس حملہ آور
جب مِرے جغرافیہ کو روندتے بڑھتے چلے آئے
تب اس آندھی کے پہلے زور ہی میں
میں جنم چکر کے گھیرے میں چلا آیا
وہ اصحافِ کہف کا حال کچھ کچھ جانتی تھی
اس لیے آندھی سے بچنے کے لیے
اک غار میں وہ جا چھپی

جنم چکر میں لہراتا ہوا کتنے ہی جنموں تک
اسے میں ڈھونڈتا پھرتا رہا
میں ساری بستیوں، صحراؤں سے ہوتا
بیابانوں تلک پہنچا
اُسے ڈھونڈا صدائیں دیں
پہاڑوں اور دریاؤں سے گزرا
اور غاروں تک بھی جا پہنچا
تبھی اک غار میں تصویر کا پیکر بنی آخر وہ مجھ کو مل گئی
میں اس مُورت کو کتنی دیر تک حیرت سے بس تکتا رہا
تکتا رہا۔۔۔ تکتے ہوئے
اس وقت خود حیرت سے مورت بن گیا
تصویر میں جب یک بیک جنبش ہوئی
انگڑائی سی لے کر وہ گہری نیند سے جاگی
اندھیرے غار کی دیوار سے نیچے اتر کر مسکرائی
میرے پاس آئی
مجھے بانہوں میں بھر کے بھینچ کے سینے سے لپٹایا
تو دو مہجور روحوں کا ملن جسموں کے رستے سے
ازل سے تا ابد پھیلے ہوئے لمحے میں جیسے
نقش سے بھرنے لگا
دو مہجوروں کے وصلِ جاوداں کی یہ کہانی
خواب کو تعبیر دیتی ہے
اک ابدی کیف سے سرشار لمحے کی گواہی
آج بھی اُس غار کی تصویر دیتی ہے!
☆☆☆

دوہا نما

او اَن دیکھے تیرے تو ہیں اربوں کھربوں رُوپ
تیرے پانے کو بدلوں آخر کتنے بہروپ

کونسا اپنا دین دھرم تھا، کونسا اپنا دیس
اصلی صورت بھول گئی تھی بدلے اتنے بھیس

پھر بس میں کچھ بھی نہیں رہتا، کچھ بھی سُوجھ نہ پائے
بیچ ندی میں گھڑی بھُس کی جب حیدر کھُل جائے

کم از کم یہ بات تو کہنے میں ہم بھی سچے ہیں
تم بھی سچے، وہ بھی سچے، بس ہم ہی جھوٹے ہیں

ساحل پر کشتی کو جلا کے پہلے تو اِترائے
پھر جب لَوٹ کے آنا ٹھہرا، تیَر کے واپس آئے

حیدؔر بھید جہاں کے جیسے خواب کے اندر خواب
ایک نقاب اگر اُلٹیں تو آگے اور نقاب

☆☆☆

ماہیے

تُو خود میں اکیلا ہے
تیرے دم سے مگر
سنسار کا میلہ ہے

☆☆☆

سب صبحوں کا تاج ہوئی
رحمتِ عالمؐ کو
جس شب معراج ہوئی

☆☆☆

مکھ دھرتی کا نُورانی
جھومر پیڑ اس کے
کھیت اِس کی ہیں پیشانی

☆☆☆

باغات کی افشاں ہے
اور حسیں جنگل
کی زُلفِ پریشاں ہے

☆☆☆

کیا رُوپ نکالا ہے
گردن میں اِس کی
دریاؤں کی مالا ہے

☆☆☆

جذبوں سا سمندر بھی
سینۂ دھرتی کے
باہر بھی ہے، اندر بھی

☆☆☆

بیٹے

دریا کی روانی ہے
اب مِرے بیٹوں میں
مِری گذری جوانی ہے

☆☆☆

بیٹیاں

مِری چڑیوں کی جوڑی ہے
اک پہلوٹھی کی
اک پیٹ کھروڑی ہے

☆☆☆

بیوی

اک رُوح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

☆☆☆

۹

سونے کی انگوٹھی ہے
پیار میں سچی ہے
پر قول کی جھوٹی ہے

☆☆☆

خود

جنموں کی اُداسی ہے
جسم ہے آسُودہ
پَر رُوح تو پیاسی ہے

☆☆☆

اِس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں

☆☆☆

منظر ترے گاؤں کے
گرم دوپہروں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

☆☆☆

ریوڑ کئی بھیڑوں کے
نہر کنارے پر
وہ سلسلے پیڑوں کے

☆☆☆

بُور آ گیا آموں میں
رونقیں جاگ اٹھیں
دیہات کی شاموں میں

☆☆☆

پگڈنڈیوں کے دل دھڑکیں
بستی میں پکی
جب بچھنے لگی سڑکیں

☆☆☆

بجلی کے لگے کھمبے
کٹ گئے، رستے میں
جو پیڑ بھی تھے لمبے

☆☆☆

اتنے نہ ترس جائیں
پیاس کے ماروں کی
آنکھیں نہ برس جائیں

☆☆☆

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

☆☆☆

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر

☆☆☆

دو پہر جوانی تھی
پل میں بیت گئی
پھر شام سہانی تھی

☆☆☆

وہ نین غزالی تھے
فیصلہ کیا ہوتا
سب اس کے سوالی تھے

☆☆☆

مل مہکی فضاؤں سے
یار نکل باہر
اندر کے خلاؤں سے

☆☆☆

چڑھتے ہوئے جامن پر
داغ لگا بیٹھے
ترے پیار کا دامن پر

☆☆☆

نہیں، ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

☆☆☆

تُو کس کا سوالی تھا
دامنِ دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

☆☆☆

سب دُکھ کے فسانے تھے
آنکھ کے آنسو تھے
یا اوس کے دانے تھے

☆☆☆

پھرتے ہیں اکیلے میں
ساتھ نہیں کوئی
صدمات کے میلے میں

☆☆☆

بے نام اُداسی کو
کون سمجھ پاتا
تیرے بَن باسی کو

☆☆☆

کچھ ہم نے ہی پی لی تھی
یا پھر سچ مچ ہی
وہ آنکھ نشیلی تھی

☆☆☆

جوگی کے نہیں پھیرے
دل جہاں آ جائے
وہیں ڈال دیئے ڈیرے

☆☆☆

کیا رنگِ بہار آیا
میک اپ اُس نے کیا
اور دل پہ نکھار آیا

☆☆☆

مُونجی کی چھڑائی تھی
پہلے پہلے بَلیئے
جب آنکھ لڑائی تھی

☆☆☆

اَن دیکھے جہانوں تک
دل نے پہنچنا ہے
چاہت کے خزانوں تک

☆☆☆

اُلجھے جو فقیروں سے
یوں سمجھو الجھے
اپنی تقدیروں سے

☆☆☆

جھُک آئے فلک سائیں
دیکھی تھی ہم نے
بس ایک جھلک سائیں!

☆☆☆

میں اک ازلی راہی
ساتھ نہ ہو یونہی
پھر سوچ لے چن ماہی

☆☆☆

بے کار کے رونے سے
کچھ بھی نہیں ملتا
پانی کو بلونے سے

☆☆☆

یہ دل بھی لگا کھلنے
لہنگا ہرا پہنے
آیا ہے کوئی ملنے

☆☆☆

چاہت کی گواہی تھے
ہم بھی کبھی یارو
اک ہیر کے ماہی تھے

☆☆☆

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہوولیوں کی

☆☆☆

بچپن کے خزانے میں
کتنے زمانے تھے
اُس ایک زمانے میں

☆☆☆

اک یاد تھی بستے میں
کھوگئی جانے کہاں
اِس عمر کے رستے میں

☆☆☆

جو چاہا بنا ڈالا
لکھا سلیٹوں پر
جب چاہا مٹا ڈالا

☆☆☆

دن تو وہی اچھے تھے
جب اسکول کے ہم
چھوٹے سے بچے تھے

☆☆☆

تختی کو سُکھاتے تھے
خواب سہانے تھے
پَر دِل کو دُکھاتے تھے

☆☆☆

وہ سُر، سنگیت گیا
قلم، دواتوں کا
اک دور تھا، بیت گیا

☆☆☆

تھے اپنی ہی لہروں میں
عمر گذاری جو
پنجاب کے شہروں میں

☆☆☆

تھے دیس میں پردیسی
آ کے ولایت میں
اب ہو گئے ہیں دیسی

☆☆☆

یہ بھید نہ کھل پائے
دل بھر آنے پر
کیوں آنکھ بھی بھر آئے

☆☆☆

رہ جاتی ہیں تعبیریں
خواب ہیں ہم شاید
اور اصل ہیں تصویریں

(جوگندر پال جی کے نام!)

☆☆☆

کچھ دل کو ملوک کرو
ویسے چن ماہی
جو چاہے سلوک کرو

☆☆☆

الجھن سے چھڑاتے ہوئے
باندھ لیا دل کو
بال اُس نے بناتے ہوئے

☆☆☆

رائن ☆ سے چناب مِلا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب مِلا
(☆ دریائے رائن جرمنی کا مشہور دریا ہے۔)

☆☆☆

دیوانہ بنا ڈالا
دل کو حسینوں نے
بُت خانہ بنا ڈالا

☆☆☆

توبہ کی جو ٹھانی ہے
سوچ لو پھر یہ تو
توہینِ جوانی ہے

☆☆☆

لفظوں کے مداری ہیں
عشق کے جذبے سے
جو شاعر عاری ہیں

☆☆☆

پھولوں کو پرونے میں
سوئی تو چبھنی تھی
اس ہار کے ہونے میں

☆☆☆

کیسے اِترائے تھے
پہلے پہل دل پر
جب زخم سجائے تھے

☆☆☆

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے

☆☆☆

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
''مغرب'' کی اذان ہوئی

☆☆☆

کس نُور کا درشن تھا
سامنا ہوتے ہی
روشن مرا تن من تھا

☆☆☆

صرف ایک ہی پل تھا وہ
خود ہی ابد بھی تھا
اور خود ہی ازل تھا وہ

☆☆☆

صحرا میں چناب ایسی
سائبر کی دنیا
بیداری میں خواب ایسی

☆☆☆

لیپ ٹاپ تک آ پہنچے

اپنے ہی کمرے میں

ہم آپ تک آ پہنچے

☆☆☆

باتیں بھی ہوتی ہیں

اور میسنجر پر

گھاتیں بھی ہوتی ہیں

☆☆☆

لکھنے میں بھی آسانی

اردو فائل کی

ترسیل بھی ارزانی

☆☆☆

لمحاتِ حضوری میں

فرق نہیں رہتا

قربت اور دُوری میں

☆☆☆

دل شہرِ مدینہ ہو

نورِ محبت سے

روشن ہر سینہ ہو

☆☆☆